ACC No.................Date..............
Section........................Status..........
D.D. Class.................. NAJAFI BOOK LIBRARY

اسلامی اخلاق

کا جدید اسلوب

ACC No.......................Date..................
Section.......................Status..................
D.D. Class..
NAJAFI BOOK LIBRARY

اسلامی اخلاق

کا جدید اسلوب

اللهم صل علی محمد وآل محمد وعجل فرجهم

امامیہ آرگنائزیشن پاکستان

NAJAFI BOOK LIBRARY
MASOOMEEN WELFARE TRUST

اسلامی اخلاق

کا جدید اسلوب

تالیف

آیۃ اللہ محمد آصف محسنی دام ظلہ

ترجمہ

شیخ محمد شفا نجفی

امامیہ پبلیکیشنز ۔ ۱۷، نور چیمبرز گنپت روڈ لاہور
فون: ۳۲۵۱۵۳

نام کتاب : اسلامی اخلاق کا جدید اسلوب

تصنیف : آیۃ اللہ محمد آصف محسنی

ترجمہ : شیخ محمد شفا نجفی

کتابت : مولانا عبدالعزیز

تزئین : عبدالحفیظ

تاریخ اشاعت : ذی العقدہ ۱۴۱۰ھ / جون ۱۹۹۰ء

قیمت : ~~چالیس~~ 50 روپے

پرنٹرز : اظہار سنز پرنٹرز

ناشر : امامیہ پبلیکیشنز ۱۷، نور چیمبرز گنپت روڈ لاہور

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by ... Welfare Trust (R)
Shop ... Heights,
... Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan

ان متدین جوانوں کے نام!

جو اپنی زندگی میں ایک عظیم و عالی ہدف رکھتے ہیں، جن کے بارے میں قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (۲۹ : ۶۹)

اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا انہیں ہم ضرور اپنی راہ کی ہدایت کریں گے اور اس میں شک نہیں خدا نیکو کاروں کا ساتھی ہے۔

محمد آصف محسنی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اپنی بات

جوانوں کو اسلامی اخلاق سے مزین کرنے کے لئے آیۃ اللہ محمد آصف محسنی دام ظلہ کی کتاب "روش جدید۔ اخلاق اسلامی" کا ترجمہ حاضر خدمت ہے۔

جوانوں کو اسلام شناس بنانے اور انہیں اسلامی نظریات و تعلیمات سے مسلح کرنے کے لئے ہمارا ادارہ عرصہ دراز سے بہترین کتب پیش کر رہا ہے، موجودہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے ذریعہ فاضل مصنّف نے مسلمانوں کو اسلامی اخلاق سے آراستہ کرنے کے لئے سائنسی انداز میں کامیاب کوشش فرمائی ہے۔

فاضل مصنّف جو کہ درجۂ اجتہاد پر فائز ہیں کے نزدیک اس کتاب میں پیش کردہ تمام احادیث مستند ہیں اور انہیں نقل کرنے میں تسامح سے کام نہیں لیا گیا۔

فاضل مصنّف افغانستان کی تنظیم "حرکت اسلامی افغانستان" کے رہبر ہیں اور آپ اپنی تنظیم کی قیادت کرتے ہوئے ایک طویل عرصہ سے افغانستان کی جنگِ آزادی میں مصروفِ جہاد ہیں۔ آپ اپنی جنگی مصروفیات کے باوجود مسلمانانِ عالم کی علمی معاونت کے لئے تصنیف و

تالیف کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے تقریباً ۴۴ کتب تصنیف و تالیف فرمائی ہیں جو کہ مسلمانوں کے علمی سرمائے میں گرانبہا اضافہ ہیں۔

امید واثق ہے کہ حسب سابق ہماری یہ پیشکش بھی قارئینِ کرام کو پسند آئے گی اور وہ اسلامی اخلاق کو اپنانے کے لئے اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

(ادارہ)

تتمۂ مقدمہ [1]

اخلاقِ حسنہ سے نزدیکی
یا
اس کیلئے راہ ہموار کرنا

مندرجہ ذیل صفات، اخلاقِ حسنہ سے متصف ہونے میں مفید اور مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں، اس منزل کے راہی کو چاہیئے کہ وہ ان سے استفادہ کرے اور کبھی بھی غفلت نہ برتے۔

۱۔ یادِ خدا

بار بار خدا کو یاد کرنا انسان کو بری صفات اور افعال سے دور رکھتا ہے اور خوفِ خدا انسان کے لئے ایک بہترین مربّی اور مؤدب ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ط (۵۹ : ۱۹)

"ہاں! خدا کو فراموش کرنا اپنے نفس کو فراموش کرنے کا باعث بنتا ہے۔"

---

[1] کتاب ہٰذا کا مقدمہ اپنی جگہ ایک مستقل کتاب ہے، اختصار سے کام لیتے ہوئے اس کا آخری حصہ قارئین کے استفادہ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

۲۔ خدا سے محبت

اگر خداوند کریم سے محبت کی توفیق انسان کے شامل حال ہے تو یقیناً حُبِ خدا فوری اور انقلابی طور پر انسان کو برائیوں سے روکتی اور نیکیوں کی دعوت دیتی ہے، یہ بہت بلند مقام ہے اس سے بڑے بڑے اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا ہے۔

از در خویش خدارا بہ بہشتم مفرست
کہ سرکوی تو از کون و مکاں مارا بس

تجربہ شاہد ہے کہ دوست، دوست کے لئے قربانی پیش کرتا ہے دوست کی خاطر بہت سی خواہشاتِ نفسانی پسِ پشت ڈالنے پر آمادہ ہوتا ہے اور دوست کی رضا و خوشنودی کے لئے زحمتوں اور مشقتوں کو بھی برداشت کرتا ہے۔ کون سا انسان ہے جس نے ماں کے اندر اپنے بچے کی محبت کے آثار نہ دیکھے ہوں یا جس نے عاشق کو معشوق کے وصال اور دیدار کی راہ میں ہر چیز کو نظر انداز کرنے پر آمادہ نہ پایا ہو، اگر ہم خدا سے محبت کریں جس کے حاصل کرنے کا طریقہ کتاب کے پہلے حصہ میں بیان کیا جائے گا، تو ہمارے بُرے اخلاق اچھے اخلاق میں تبدیل ہو جائیں گے۔

۳۔ یادِ موت وفنا

اپنے معدوم اور دنیا سے رخصت ہو جانے کا تصوّر کسی حد تک حرص، طمع، بخل، حسد، دشمنی اور غم و اندوہ جیسی مذموم صفات سے انسان کو

دُور رکھتا ہے، لیکن اس طرف توجہ ضروری ہے کہ کہیں موت کی یاد، مادیات اور معنویات میں پسماندگی کا باعث اور انسان کی سستی و بے کاری کا بہانہ نہ بننے پائے، چاہیئے کہ انسان اپنی اور اسلامی معاشرہ کی خاطر اس طرح فعال و متحرک رہے جیسے اسے ہمیشہ زندہ رہنا ہے اور آخرت و تکمیلِ نفس کے لئے اس طرح کوشاں رہے جیسے اسے کل مرنا ہے[1]

۴۔ بلند ہمتی

اگرچہ بذاتِ خود یہ صفت کسی نہ کسی سبب کی محتاج ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ صفت بہت سے مکارم اخلاق سے متصف ہونے کے علاوہ کئی اخلاق رذیلہ سے اجتناب کا بھی سبب بنتی ہے جس کی دلیل تجربہ ہے۔

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
ز ہر چہ رنگ تعلق پزیرد آزاد است
ما رھروان بخلوت شب چون سفر کنیم
بر تاج خسروان بحقارت نظر کنیم

---

[1] ایک مشہور حدیث امام حسن علیہ السلام سے مروی ہے:

کن لدنیاک کانک تعیش ابدا و کن لآخرتک کانک تموت غدا

چونکہ اس روایت کی سند ضعیف ہے، اس لئے متن میں مستقل روایت کے عنوان سے ذکر نہیں کیا۔

نظر آنان کہ نکر دند در این مشت خاک
الحق انصاف توان داد کہ صاحب نظرند

۵۔ زیادہ فکر کرنا

مادی، معنوی اور نفسیاتی اعتبار سے لوگوں کی عاقبت اور انجام کے بارے میں زیادہ فکر کرنا ہر میدان، خاص کر تزکیۂ نفس میں کافی حد تک مفید ثابت ہوتا ہے یہ حقیقت ہے کہ انسان کا سب سے اعلیٰ ترین سرمایہ اس کی فکر ہے[۱] اگر دن میں یا کم از کم کئی دنوں میں انسان کو خدا اور جہان سے رابطہ کے بارے میں چند لمحے فکر کرنے اور سوچنے کی عادت پڑ جائے تو یقیناً انسان اچھے نتائج تک پہنچ سکتا ہے۔

امام رضا علیہ السلام معمر بن خلاد کی روایت صحیحہ میں فرماتے ہیں:

"زیادہ نمازیں پڑھنا یا روزے رکھنا ہی عبادت نہیں بلکہ خدائی کاموں میں فکر کرنا (باعث) عبادت ہے"[۲]

---

[۱] جب کبھی میرا سرکش نفس کسی سے حسد کرنے پر مجھے آمادہ کرتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ یہ شخص اس قابل نہیں کہ اس سے حسد کیا جائے، ایک چینی لیڈر اس قابل ہے کہ اس سے حسد کیا جائے جو کہ ایک ارب آبادی پر حکومت کرتا ہے، بیچارہ مسلمان جو ایک معمولی سی نعمت سے بہرہ ور ہے، اس قابل نہیں ہے کہ اس سے حسد کیا جائے، یہ طرز تفکر حسد سے اجتناب کرنے میں کسی حد تک مفید رہا ہے۔

[۲] اصول کافی، ج ۲، ص ۹۲۔

قرآن کریم کی بہت سی آیات فکر کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ فکر کی زیادہ اہمیت کے پیشِ نظر فلاسفروں نے فکر کو حقیقت انسان کا جزء قرار دیا ہے اور انسان کی تعریف میں کہا گیا ہے:

"الانسان حیوان متفکّر۔ (ناطق)

قرآن مجید کی ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"ان لوگوں کو بشارت اور خوشخبری دو جو باتوں کو سنتے، ان میں سے اچھی باتوں کی پیروی کرتے اور ان پر عمل کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت فرمائی ہے اور یہ صاحب عقل ہیں۔"

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ط (۱۷ : ۳۶)

"جس چیز کا تمہیں علم نہیں، اس پر کورانہ اور بغیر فکر کئے عمل نہ کرو۔"

اکثر اوقات اتفاق ہوتا ہے کہ انسان اندھی تقلید کرتے ہوئے بیہودہ اور غلط عادات میں کئی سال گزار دیتا ہے اور اچانک کسی لمحے میں اپنی فکر کو کام میں لانے سے ان عادات کے بیہودہ ہونے کی طرف متوجہ ہوتا ہے، ایسے موقع پر سوائے شرمندگی اور شرمساری کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا، اگر اس نے شروع ہی سے فکر سے کام لیا ہوتا تو اس کی قیمتی عمر ضائع نہ ہوتی۔ امیرالمؤمنین علیہ السلام کی روایت صحیحہ میں ہے کہ عیسیٰؑ بن مریم نے فرمایا:

طوبی لمن کان صمتہ فکرا و نظرہ عبرا و وسعہ بیتہ و

بکی علی خطیئتہ وسلم الناس من یدہ ولسانہ۔[1]

"وہ شخص خوش نصیب ہے جس کے سکوت میں فکر ہو جس کی نگاہ عبرت کی ہو اور جو زیادہ تر گھر میں رہتا ہو، اپنے گناہوں پر گریہ کرتا ہو اور لوگ اس کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ رہیں۔"

۶۔ مطالعہ

اخلاق، تفسیر، معارف اسلامی کی کتب، بہشت دوزخ کے درجات اور خاص کر انبیاء، اولیاء اور صلحاء جیسے کامل انسانوں کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ معنوی تحرک اور انقلاب میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

۷۔ تقویٰ

واجبات کی ادائیگی اور محرمات کو ترک کرنا بلکہ مستحبات کو اہمیت دینا تقویٰ اختیار کرنا اور فقہی (شرعی) فرائض کا بجا لانا باطن کی صفائی اور تزکیۂ نفس میں بہت زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔

انَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔

"بے شک نماز (نمازگزار کو) بُرے کاموں سے روکتی ہے۔"

اخلاق، تربیت اور تکمیل نفس کی راہ پر چلنے والوں کو اس پر فیض راہ

---

[1] بحارالانوار منقول از الخصال، ج ۹۳، ص ۹۳۔

سے غافل نہیں رہنا چاہیئے، کیونکہ اس راہ پر چلنے والا بہت جلدی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

۸۔ ہیجان خیز چیزوں سے دوری

عشق و محبت، جرائم، عریانی اور شہوت کی کتب کا مطالعہ نہ کیا جائے، شہوت انگیز آوازوں کو نہ سنا جائے، غرض ہر اس چیز سے اجتناب کیا جائے جس سے قابلِ مذمت حیوانی صفات حرکت میں آ سکتی ہیں، ایک معتبر روایت میں معصوم (ع) فرماتے ہیں:

"النظرۃ بعد النظرہ تزرع فی القلب شھوۃ وکفیٰ بھا لصاحبھا فتنۃ"

"مرد کا جوان عورت کی طرف بار بار دیکھنا یا جوان لڑکیوں کا بار بار جوان کو دیکھنا دل میں شہوت کا بیج بو دیتا ہے اور دیکھنے والے کو کافی حد تک فتنے میں مبتلا کر دیتا ہے"

۹۔ نیکوں کی رفاقت

نیک، متدین اور خدا ترس لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چاہیئے اور وعظ و نصیحت کی محفلوں میں شرکت کرنی چاہیئے، نیز برے دوستوں، بداخلاقوں، ذلیلوں، بے عقلوں اور فاسقوں سے دور رہنا چاہیئے۔

۱۰۔ نفس کو سزا دینا

نفس کو تنبیہ کرنے اور اسے بداخلاقی سے روکنے کے لئے بعض سختیوں کے ذریعے اسے سزا دی جاسکتی ہے۔

مثال کے طور پر چند رکعت نماز کی منت مانی جائے یا قسم اٹھائی جائے یا روزہ رکھے یا ایسے شخص کے پاس جانا اور اس سے معذرت خواہ ہونا اپنے پر واجب قرار دے جس سے دشمنی وحسد رکھتا ہو، یا کسی کی مہمان نوازی کی نذر مانی جائے یا فقراء اور عام کارِ خیر پر مال خرچ کرنے کا عہد کرے۔

لیکن نفس کی توہین اور بعض حرام کاموں کا ارتکاب کرنا جس کی تاکید بعض صوفیا، سادہ لوح اور نادان لوگ لوگوں کے سامنے نفس کی تحقیر کرنے کے لئے کرتے ہیں، صحیح نہیں ہے، مسلمان کو چاہیئے کہ وہ حرام کے ذریعے اخلاقیات سے متصف نہ ہو۔ کیونکہ یہ اگر ممکن بھی ہو تو حماقت ونادانی ہے۔

۱۱۔ بیرونی نگرانی

انسان فطری طور پر خود پسند ہوتا ہے اپنی ہر چیز وصفت کو اچھا سمجھتا ہے اور بہت کم اپنے عیبوں اور خامیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ اگر انسان کے کچھ سمجھدار دوست ہوں تو ان سے درخواست کرے کہ وہ اس کی نگرانی کریں اور اس کی اخلاقی خامیوں اور شریعت کی خلاف ورزیوں کو کھول کر اس کے سامنے رکھیں۔

دوست اپنے دوست کے لئے آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔[1]

---

[1] اے غزالی گریزم از یاری که اگر به کنم نیکو گوید ←

۱۲۔ بدگوئی و تنقید پر توجہ

یہ ضرب المثل مشہور ہے

"عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد"

"اگر خدا چاہے تو دشمن بھی خیر و برکت کا سبب بنتا ہے"۔

عین مناسب ہے کہ انسان دشمن تک کے اعتراضات و تنقید پر توجہ کرے اور ان کے ہر اعتراض کو دشمنی و جہالت کی نگاہ سے نہ دیکھے، یہ احتمال دے کہ کم از کم بعض اعتراضات برحق اور درست ہیں تاکہ اپنی اصلاح کے بعد انہیں عملی طور پر جواب دیا جا سکے بہرحال ہر انسان اپنے اوپر ہونے والے اعتراضات اور تنقیدوں کے صحیح ہونے کا اجمالی علم رکھتا ہے، اس علم کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور اس کے مطابق عملی اقدام کرنا چاہیئے۔

۱۳۔ تربیت کا اثر

عام طور پر انسان کسی لائق اور قابل مربّی کے بغیر کسی مقام تک نہیں پہنچ سکتا، ایسا اخلاق جو وراثت، طبیعت اور مزاج کے نتیجے میں حاصل ہو بہت کم اور اتفاقی ہے، والدین بلکہ سرپرست اور اس کے بعد اساتذہ کی بچپن میں تربیت کافی حد تک انسان کا مقدر بنا سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہودیوں

مخلص آن شوم کہ عیبم را ہمچو آئینہ رو برو گوید

نہ کہ چون شانہ با ہزار زبان دشت سر رفتہ مو بمو گوید

کے بچے یہودی، نصرانیوں کی اولاد نصرانی اور مسلمانوں کے بچے مسلمان بن جاتے ہیں، اگر کہیں اس کے برعکس یہودی کا بچہ یہودی، نصرانی کا بچہ نصرانی اور مسلمان کا بچہ مسلمان نہ ہو تو اس کے عوامل اور اسباب دوسرے ہوتے ہیں۔ بچوں کے سرپرستوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت پر زیادہ سے زیادہ توجہ دیں تاکہ اپنی اور دیگر متعلقین کی اولاد اور بچوں کو اچھے اور عالی اخلاق سے آراستہ کیا جا سکے۔

۱۴۔ نفسیات اور طب کا مطالعہ

اگر استعداد ہو تو نفسیاتی مسائل کا بھی کچھ نہ کچھ مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے یا اسے استاد سے پڑھا جائے، کیونکہ ان مسائل کا سمجھنا اخلاقی مسائل میں کافی ممد و معاون ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض غذاؤں اور بیماریوں کی خاصیتوں اور انسان کے اخلاق پر ان کے اثرات سے بھی آگاہی ہونی چاہیئے۔[1]

۱۵۔ گرد و پیش کے ماحول پر نظر

انسان کو چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے والدین اور اجداد کے حالاتِ زندگی کا بھی مطالعہ کرتا رہے، ان کی اخلاقی برائیوں کی تحقیق کرے اور ان کا سراغ لگائے، پھر اپنی طرف متوجہ ہو کہ قانون وراثت کے تحت کہیں کوئی صفت

---

[1] بدقسمتی سے راقم نفسیات، طب اور غذاؤں کی خاصیت اور ان کے اثرات سے آگاہی نہیں رکھتا۔

اس میں بھی تو سرایت نہیں کرگئی۔

لقمان حکیم سے پوچھا گیا:

آپ نے ادب کس سے سیکھا؟

انہوں نے جواب دیا:

میں نے ادب بے ادبوں سے سیکھا ہے، اس طرح کہ بے ادبوں کی حرکت اور ان کا عمل مجھے بُرا لگتا تھا اور میں اس سے اجتناب کرتا تھا۔

اسی طرح انسان کو چاہیئے کہ اپنے چھوٹے بڑے سیاسی اور اجتماعی ماحول کو بھی زیرِ نظر رکھے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نادانستگی میں وہ اس ماحول سے متاثر ہو جائے جو دوسروں نے اپنے مذموم عزائم کی خاطر بنا رکھا ہے، اس کے علاوہ ایک ہوشیار اور ذہین مسلمان کو دنیا کے حالات سے باخبر رہنا چاہیئے۔

حالاتِ قلب

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اس مادی بدن کے علاوہ ایک نورانی جوہر بھی رکھتا ہے جو نفس، روح، قلب، جان اور رواں کہلاتا ہے۔[1]

---

[1] صحیح روایت میں ہے: عبداللہ بن سنان نے حضرت امام جعفر صادق (ع) سے پوچھا:

فرشتے افضل ہیں یا بنی آدم؟ آپ (ع) نے فرمایا:

قال امیرالمؤمنین (ع) ان اللہ رکب فی الملائکۃ عقلا بلا شھوۃ ورکب فی البھائم شھوۃ بلا عقل ورکب فی بنی آدم کلیتھما فمن غلب عقلہ شھوتہ فھو خیر من الملائکۃ ←

مادیین (جو روح کے منکر ہیں) کے نظریات کے برعکس انسان کی انسانیت، اس کے کمالات، ترقی اور انحطاط کا مرکز یہی غیر محسوس جوہر ہے، چاہے ہم اسے مجرد مانیں جسکے دلائل فلسفہ کی کتابوں میں مذکور ہیں یا اسے ایک لطیف جسم تسلیم کریں جس کے بعض متکلمین (علماء کلام) قائل ہیں۔[1]

جس طرح علم طب کا تعلق انسانی بدن سے ہے اسی طرح علم اخلاق کا تعلق انسان کی روح سے ہے، اگرچہ روح کے حالات بدن پر اور بدن کے حالات روح پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان دونوں کے حالات ایک دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں جو قابلِ انکار نہیں۔

← ومن غلب شهوته عقله فهو شر من البهائم۔

(یعنی) حضرت امیرالمؤمنین (ع) نے فرمایا: خدا نے فرشتوں کو عقل دی ہے اور شہوت نہیں دی، چوپایوں کو شہوت دی ہے اور عقل نہیں دی، بنی آدم کو شہوت اور عقل دونوں دی ہیں، اگر انسان کی عقل شہوت پر غالب آئے تو وہ فرشتوں سے بہتر ہے اور اگر اس کی شہوت اس کی عقل پر غالب آئے تو وہ چوپایوں سے بدتر ہے۔

(الوسائل، ج ۱۱، ص ۱۶۴)

[1] بعض مفسرین اور اہلِ معقول کے برخلاف، جو نفس کا مجرد ہونا قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن سے نفس کا تجرد ثابت نہیں ہوتا اور نہ اس سے اس کے جسم ہونے کا پتہ چلتا ہے، بلکہ بحث عقلی دلائل پر کی جانی چاہیئے، نفس کے مجرد نہ ہونے پر اجماع کا دعویٰ مضحکہ خیز ہے۔
راقم کی تفسیر موضوعی "فواید مشتی" ملاحظہ فرمائیں۔

حواس ظاہری و باطنی اور اعضائے بدن کے مقابلے میں نفس کی دو مختلف حالتیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک لحاظ سے نفس، علت اور موثر کا کردار ادا کرتا ہے کیونکہ تمام کے تمام ادراکات بشر اور اس کی حرکات و سکنات نفس ہی کے آثار ہیں اگرچہ ظاہراً وہ حواس اور اعضاء کے ذریعے انجام پذیر ہوتے ہیں۔

النفس فی وحدتہ کل القویٰ

"نفس، واحد اور منفرد ہونے کے باوجود تمام قوتوں کا مجموعہ ہے۔"

ایک لحاظ سے انسان کے ادرکات اور افعال، نفس اور اس کے ملکات (وہ صفات جو نفس میں راسخ ہوں) پر اثر انداز ہوتے ہیں اور نفس کے بلند ترین (بہترین مخلوق) اور پست ترین (بدترین مخلوق) مراتب و درجات انہیں ادرکات و افعال کا نتیجہ ہیں

بہرحال مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر قارئین محترم کی معلومات کے لئے قرآن کے نقطۂ نگاہ سے نفس و قلب کے حالات کی طرف اشارہ کیا جائے:

قرآن مجید میں اس بات کے شواہد اور دلائل موجود ہیں کہ قلب (دل) سے مراد نفس ناطقہ ہے، اگرچہ اس سلسلے کی بعض آیات میں قلب سے نفس ناطقہ مراد لینا خالی از اشکال نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ نفس کو "قلب" کے لفظ سے کیوں یاد کیا گیا ہے اور ان دونوں میں کیا مناسبت ہے؟ اس کا ہمیں صحیح علم نہیں ہے۔

فارسی، عربی، پشتو، اردو، انگلش اور شاید سب یا اکثر زبانوں میں جس طرح گوشت کے اس ٹکڑے کو دِل کہا جاتا ہے جو خون کو گردش دیتا اور صاف کرتا ہے، اسی طرح انسان کے اس جوہرِ باطنی کو بھی دل سے تعبیر کیا جاتا ہے جو محبت، دشمنی، قوت، خوف، عشق اور نفرت جیسی صفات و غرائز کا مرکز ہے، شاید آئندہ

دور میں سائنسی علوم کی ترقی خصوصاً فزیالوجی کی ترقی اس معمہ کی وضاحت اور قرآنی آیات کی دلالت کی مدد کرے گی، بہرحال انسان کا دل و قلب کچھ اوصاف سے متصف ہوتا ہے، جن کی طرف قرآن مجید اشارہ کر رہا ہے:

۱۔ <u>قلب لاہی</u>: وہ دل جو لہو و لعب میں مصروف ہو۔

مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ ....

وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۙ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۗ (۲۱: ۲-۳)

"جب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس کوئی نیا حکم آتا ہے.... اور اس کا ہنسی کھیل اڑاتے ہیں۔ ان کے دل (آخرت کے خیال سے) بالکل بے خبر ہیں۔"

۲۔ <u>قلب زائغ</u>: (ٹیڑھا)

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ . (۳: ۷)

"پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے۔"

فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ ۚ (۶۱: ۵)

"تو جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا ہی رہنے دیا۔"

۳۔ <u>قلب غافل</u>: وہ دل جسے غافل کر دیا گیا ہو:

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا . (۱۸: ۲۸)

"اور جس کے دل کو ہم نے (گویا خود) اپنے ذکر سے غافل کر دیا۔"

۴۔ <u>صدر ضیق و شروح</u>: تنگ اور کشادہ سینہ

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ و

مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا (۶ : ۱۲۶)

"تو خدا جس شخص کو راہِ راست دکھانا چاہتا ہے اُس کے سینے کو اسلام (کی ودیعت) کے واسطے (صاف اور) کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو گمراہی کی حالت میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو تنگ اور دشوار گزار کر دیتا ہے۔

۵۔ قلبِ قسی : سخت دِل۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ . (۲ : ۷۴)

"پھر اس کے بعد تمہارے دِل سخت ہو گئے"۔

وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً . (۵ : ۱۳)

اور ان کے دلوں کو (گویا) خود ہم نے سخت بنا دیا۔

۶۔ قلب و نفسِ امارہ : برائیوں کا حکم دینے والا :

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ (۱۲ : ۵۳)

"نفس برابر برائی کی طرف ابھارتا ہی رہتا ہے، مگر جس پر میرا پروردگار رحم فرمائے۔"

۷۔ قلبِ مریض :

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (۲ : ۱۰)

"ان کے دلوں میں مرض تھا۔"

۸۔ قلبِ مقفول :

اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷ : ۲۴)

"یا (ان کے) دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں۔"

۹۔ قلب مکنون : پوشیدہ

وَ جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ وَ فِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا ط (۶ : ۲۵)

ہم نے خود ان کے دلوں پہ پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کانوں میں بہرا پن پیدا کر دیا ہے کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔

۱۰۔ قلب مختوم : جس پر مہر لگی ہوئی ہو۔

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (۲ : ۷)

۱۱۔ قلب مطبوع :

ایک ہوشیار اور باریک بین انسان اگر مذکورہ آیات کریمہ میں غور کرے تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ قلب کو لاحق ہونے والی ان دس یا گیارہ صفات کا سبب مکلفین کا کفر، عناد، نفاق اور ان کی معصیت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں اور دل کو ان خطرناک و مہلک صفتوں سے صرف ایمان و تقویٰ کے ذریعے پاک کیا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ قلب وجل : ڈرنے والا دل

اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ (۸ : ۲)

"جب خدا کو یاد کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں"

۱۳۔ قلب خاشع : پُرسکون اور متواضع دل

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ۔ (۵۷ : ۱۶)

"کیا ایمانداروں کے لئے ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا کہ خدا کی یاد

اور قرآن کے لئے جو (خدا کی طرف سے) نازل ہوا ہے ان کے دل نرم ہو جائیں"۔

۱۴۔ قلب منیب: رجوع کرنے والا دل

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ۔ (۵۰:۳۳)

"جو شخص خدا سے بے دیکھے ڈرتا رہا اور خدا کی طرف رجوع کرنے والا دل لے کر آیا"۔

قیامت کے حساب کتاب اور اس کی جزا کو یاد کر کے ڈر جانا ہر شخص کے لئے قابلِ عمل ہے، اسی طرح معصیت اور مخالفت کے بعد رجوع اور توبہ بھی ہر ایک کے لئے ممکن ہے۔

۱۵۔ قلب مطمئن: پر سکون دل

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔ (۱۳ : ۲۸)

"جنہوں نے ایمان قبول کیا ان کے دلوں کو خدا کی یاد سے تسلّی ہوا کرتی ہے یاد رکھو کہ خدا ہی کی یاد سے دلوں کو تسلی ہوا کرتی ہے"۔

اس خدا کی یاد، جو ہر چیز کا عالم اور ہر چیز پر قادر ہے جو مہربان اور حکیم ہے جس کا فضل اور احسان ہر وقت جاری ہے یقیناً دل کو سکون اور وقار بخشتی اور متانت اور استحکام میں اضافہ کرتی ہے، "قلب مطمئن" مضبوط دل کو کہا جاتا ہے، جو حوادث زمانہ سے خوفزدہ نہ ہو، بے مقصد لوگوں کے استہزاء اور تمسخر کی جو پرواہ نہ کرتا ہو، اور کوئی چیز و طاقت جسے اپنے ہدف سے دُور نہ کر سکے۔

یہ آیت کریمہ کتنی شیریں اور گہری ہے:

وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ۔ (۳۰ : ۶۰)

"اور (کہیں) ایسا نہ ہو جو لوگ تمہاری تصدیق نہیں کرتے تمہیں ہلکا کر خفیف کر دیں۔"

بے مقصد اور بے عقیدہ لوگ تمہیں معنوی ترقی اور انسانیت کی راہ سے ہلکا اور تیرے وقار کو ختم نہ کرنے پائیں، بلکہ تمہیں ثابت قدم رہنا چاہیئے تاکہ تمہارا روحانی اور معنوی وزن ان بے عقیدہ لوگوں کو ہلکے پن اور مطلق العنانی سے نکال کر کمالِ انسانیت تک پہنچائے اور انہیں صرف حق کے محور و مرکز کے گرد گھمائے، امام باقر علیہ السلام موثقہ زرارہ میں فرماتے ہیں:

المؤمن اصلب من الجبل الجبل یستقل منه والمؤمن لا یستقل من دینه شئ[1]

"مؤمن پہاڑ سے زیادہ سخت ہے کیونکہ پہاڑ کو توڑ کر اسے کم کیا جا سکتا ہے لیکن مؤمن کے دین کو گھٹایا نہیں جا سکتا۔"

بہرحال انسان کی اخلاقی، اجتماعی، سیاسی، مادی اور روحانی زندگی میں قلبِ مطمئن ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وقار کے بہت فوائد و ثمرات ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ (۳ : ۱۵۳)

---

[1] کافی، ج ۳، ص ۳۹۹۔

"اس وقت کو یاد کرو جب تم فرار ہو رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتے تھے، یہاں تک کہ رسولِ خدا (ص) تمہیں دوسروں کی مدد کے لئے پکار رہے تھے، تم نے اس کی طرف توجہ نہ دی، خدا نے (اس فرار کی سزا میں) تمہارے غم میں اضافہ کر دیا تا کہ آئندہ کوئی چیز ہاتھ سے جانے یا ہاتھ آنے سے محزون و غمگین نہ ہو۔"

اس آیہ کریمہ کی طرف توجہ فرمائیں تا کہ یہ حقیقت ذہن میں بیٹھ جائے کہ ناگوار حوادث سے روحِ مؤمن کو متأثر نہیں ہونا چاہیئے اور نہ ہر حادثے سے گھبرانا چاہیئے۔

ایک دوسری آیۂ کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ. لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا. (۵۷ : ۲۲-۲۳)

"جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے وہ پہلے سے تقدیر میں لکھی جاچکی ہے تا کہ اس چیز سے نہ گھبراؤ جو تمہارے ہاتھ سے ضائع ہو جائے اور اس چیز کی وجہ سے زیادہ خوش نہ ہو جو تمہیں مل جائے۔"

ممکن ہے آیتِ کریمہ میں فکرمندی اور خوشحالی سے مراد زیادہ فکرمندی اور زیادہ خوشحالی ہو جو کہ مایوسی تکبر و غرور کا باعث بن جائے ورنہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ایسے موقعوں پر بلا ارادہ فکرمند اور خوشحال ہو جاتے ہیں۔

بہر حال یہ بہت بلند اور عزیز مقام ہے، اس مقام تک پہنچنا بلکہ اس مقام کو سمجھنا راقم جیسوں کے لئے بہت مشکل ہے۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ.

اس بحث کے آخر میں اس نکتہ کا ذکر ضروری ہے کہ اطمینان نفس کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ نفس، خدا سے راضی ہو اور خدا، نفس مطمئنہ سے راضی ہو اور اس کا انجام بہشت میں داخل ہونا ہے۔

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ. ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً.
فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ. وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ. (۸۹ : ۲۷-۳۰)

اے اطمینان پانے والی جان اپنے پروردگار کی طرف چل، تو اس سے خوش وہ تجھ سے راضی، تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میرے بہشت میں داخل ہو جا۔

۱۶۔ قلب سلیم:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ. اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ. (۲۶ : ۸۸-۸۹)

جس دن نہ تو مال ہی کام آئے گا اور نہ لڑکے بالے، مگر جو شخص خدا کے سامنے (گناہوں سے) پاک دل لئے ہوئے حاضر ہوگا۔

ہر وہ دل جو معصیت، نفاق، شرک اور کفر کی بیماری میں مبتلا نہ ہو قلب سلیم ہے۔ موثقہ ابی بصیر میں امام (ع) فرماتے ہیں:

"جب بھی انسان سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ ثبت ہو جاتا ہے، اس کے بعد اگر بندہ توبہ کر

لے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے، اگر دوسرا گناہ کرے تو نقطے کی سیاہی بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتی ہے، پھر کبھی بھی ایسا انسان کامیاب نہیں ہو سکتا"۔[1]

۱۷۔ **نفس لوامہ : ملامت اور سرزنش کرنے والا دل**

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۷۵ : ۲)

"اور (برائی سے) ملامت کرنے والے جی کی قسم کھاتا ہوں"۔

نفسِ لوامہ، نفس امارہ سے بہتر اور نفس مطمئنہ سے کمتر ہے۔ صحیحہ ثمالی میں امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

القلوب ثلاثۃ، قلب معکوس لا یعثر علی شئ من الخیر وھو قلب الکافر وقلب فیہ نکتۃ سوداد فالخیر والشر فیہ یعتلجان فما کان منہ اقوی غلب علیہ وقلب مفتوح فیہ مصباح یزھر فلا یطفأ ھذہ الیٰ یوم القیامۃ وھو قلب المؤمن۔[2]

"دل تین قسم کے ہوتے ہیں، الٹا دل، جس میں کسی خیر کی گنجائش نہیں ہوتی یا کسی خیر کو نہیں سمجھ سکتا، یہ کافر کا دل ہے، دوسرا دل وہ ہے جس میں سیاہ نکتہ ہے اس میں خیر اور شر دونوں برسرپیکار ہیں ان میں سے جو بھی طاقتور ہو گا وہ غالب آجائے گا۔ تیسرا دل کھلا دل ہے جس میں (ہدایت کا)

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۳۷۳۔

[2] بحار، ج ۷۰، ص ۵۱۔

چراغ روشن ہے اور یہ کبھی گل نہیں ہو سکتا، یہ مؤمن کا دِل ہے۔"

دِل کے خیالات

برے خیال کو وسوسہ اور اچھے خیال کو الہام کہا جاتا ہے:

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا. فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا. (۹۱: ۷-۸)

"انسانی جان اور اسے ہم آہنگ کرنے والے کی قسم جس نے نفس کو برے اور نیک کام کا الہام کیا۔

ظاہر ہے کہ دِل بہت سی خوبیوں اور برائیوں کو چاہتا ہے، ہر وقت اچھے اور بُرے خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے اور عام لوگ اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے، اگرچہ بعض اوقات ان برائیوں کے تصور سے بھی اذیت ہوتی ہے چہ جائیکہ ان سے راضی ہوا جائے۔

صحیحہ حماد میں امام جعفر صادق (ع) فرماتے ہیں:

ما من قلب الاولہ اذ فان علی احدھما ملك مرشد و علی الآخر شیطان مفتن ھٰذا یأمرہ وھٰذا یزجرہ الشیطان یأمرہ بالمعاصی والملك یزجرہ عنھا۔

"کوئی ایسا دِل نہیں جس کے دو کان نہ ہوں، ایک کان پر ایک فرشتہ ہے جو ہدایت کرتا ہے اور دوسرے کان پر گمراہ کن شیطان ہے جو برائیوں کا حکم دیتا ہے اور اچھائیوں سے روکتا ہے، شیطان گناہ کا حکم دیتا ہے اور فرشتہ گناہ سے روکتا ہے۔"

صحیحہ آبان میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما من مؤمن الا ولقلبه اذنان فی جوفه اذن ینفث فیها الوسواس الخناس واذن ینفث منها الملک یؤید اللہ المؤمن بالملک وذالک قوله تعالیٰ وایده بروح منه[1]

"ہر مؤمن کے دل میں دو کان ہوتے ہیں، ایک کان میں شیطان وسوسہ ڈالتا ہے اور دوسرے میں فرشتہ ہدایت کی باتیں، خدا فرشتے کے ذریعے مؤمن کی تائید فرماتا ہے، چنانچہ "وایده بروح منه" کا مطلب یہی ہے"۔

انسان کو چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے نفس میں آنے والے خیالات میں سے اچھے اور نیک خیالات کا انتخاب کرے اس لئے کہ اس کا اثر بہت اچھا ہوتا ہے، اگرچہ فی الحال اس خیال پر عمل کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو۔

صحیحہ ابی بصیر میں امام (ع) فرماتے ہیں:

ان العبد المؤمن الفقیر لیقول یارب ارزقنی حتی افعل کذا و کذا من البر وجوه الخیر فاذا علم اللہ عزوجل ذالک منه بصدق نیته کتب اللہ له من الاجر مثل ما یکتب لو عمله ان اللہ واسع علیم[2]

"بعض اوقات فقیر بندہ مؤمن درگاہ خداوندی میں سوال کرتا ہے

---

[1] بحار، ج ۷۰، ص ۲۶۷۔

[2] "، ج "، ص ۱۱۹۔

پالنے والے! مجھے رزق (مال و دولت) عطا فرما تاکہ میں اسے کارِ خیر میں خرچ کروں، اگر وہ اپنی اس نیت میں سچا اور صدقِ دل سے یہ نیت رکھتا ہو تو خداوند اس کے نامۂ اعمال میں اتنا ہی اجر و ثواب لکھ دیتا ہے جتنا کہ عملی طور پر خرچ کرنے کی صورت میں لکھا جاتا. اگرچہ اس نے یہ عمل ابھی انجام نہیں دیا. بے شک اللہ وسعت والا اور جاننے والا ہے۔"

بہر حال متوجہ رہنا چاہیئے کہ شیطان نے سوائے خدا کے مخلص بندوں کے باقی سب کو گمراہ اور اغوا کرنے کی قسم کھا رکھی ہے اور صاف الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ وہ لوگوں کی تاک میں ہے اور ان کو راہِ راست سے منحرف کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے اور چاروں طرف سے لوگوں کو گمراہ کرنے پر تلا ہوا ہے لیکن گمراہی وسوسہ کے تمام وسائل و ذرائع یا بُرے خیالات کو دل میں ڈالنے اور برائیوں کی دعوت دینے کی صورت میں ہے. اس کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان خدا کو یاد کرے اور اس کی پناہ لے:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ. وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ. مَلِكِ النَّاسِ. اِلٰهِ النَّاسِ. مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ. الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ. مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ.

اس بحث کے آخر میں یہ جاننا بھی لازم ہے کہ گناہ کی تمنا اور دل میں اس کا ارادہ کرنا بھی ایک جرأت ہے، جو عقلاً حرام ہے، بلکہ بعید نہیں کہ شرعاً بھی حرام ہو، لیکن معصیت کا تصوّر حرام نہیں ہے اگرچہ بُرا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لاھلہ والصلاۃ علی الانبیاء والائمۃ لا سیما محمّد و آلہ والسلام علی اصحابہ المھتدین و علینا وعلی جمیع الصّالحین.

اس کتاب میں اسلامی اخلاقیات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ خدا سے انسان کا اخلاقی رابطہ

۲۔ انسان کا انفرادی اخلاق

۳۔ انسان کا معاشرتی اخلاق

خدا سے انسان کا اخلاقی ربط سمجھنے کی جہاں تک راقم الحروف کو توفیق نصیب ہوئی ہے۔ اسے بطور خلاصہ بیس اوصاف میں پیش کیا جا سکتا ہے، ہر مؤمن میں ان اوصاف کا ہونا لازمی ہے۔ بلکہ اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ ان اوصاف کی اعلیٰ ترین منازل پر فائز ہو۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

(۲۹ : ۶۹)

ترجمہ: اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا انہیں ہم ضرور اپنی راہ کی ہدایت کریں گے اور اس میں شک نہیں کہ خدا نیکوکاروں کا ساتھی ہے۔

پہلا حصّہ

خدا سے انسان کا اخلاقی رابطہ

• خدا سے محبت و دوستی • حُبِّ خدا کے آثار • مصائب کا خطرناک جال
• مصائب و آلام کے علل و اسباب • یادِ خدا • اخلاص • ریا، سمعہ اور تکلّف
• یقین رکھنا • اختتامیہ • توکل بر خدا • توکل پر ایک بحث • تفویض
• تسلیم بخدا • رضائے خدا • شکر گزاری • شکر کی تفسیر • خشوع
و خضوع • حیاء • خشیّت، خوفِ خدا • خوفِ خدا کا معنی • خوف
• خوف کے بارے میں • آخری اور معتبر روایت • امید و عدم یاس
• مکرِ الٰہی سے بے خطر نہ ہونا • حسنِ ظن • وفائے عہد • ہر چیز میں
خود کو خدا کا محتاج سمجھنا • توبہ کرنا • خلاصہ۔

۱۔ خدا سے محبت اور دوستی

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ

(۲: ۱۶۵)

(ترجمہ) اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کے سوا (اوروں کو بھی خدا کا) مثل اور شریک بناتے ہیں (اور) جیسی محبت خدا سے رکھنی چاہیئے ویسی ہی ان سے رکھتے ہیں اور جو لوگ ایماندار ہیں وہ ان سے کہیں بڑھ کر خدا کی الفت رکھتے ہیں۔

سورہ توبہ کی آیت ۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے :

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

ترجمہ: (اے رسولؐ) تم کہدو کہ تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی بند اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبہ والے اور وہ مال جو تم نے کما کے رکھ چھوڑے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو، اگر تمہیں خدا سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو تم ذرا ٹھہرو یہاں تک کہ خدا اپنا حکم (عذاب) موجود کرے اور خدا نافرمان لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔

اس آیت کریمہ کے مطابق مؤمن کے دل میں مال دنیا اور اعزاء و اقارب سے زیادہ خدا، رسول (ص) اور دینِ خدا کی ایسی محبت ہونی چاہیئے کہ جیسے خدا چاہتا ہو ایسے ہی وہ چاہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ط (۷۶۔۳۰)

ابو حمزہ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایتِ صحیحہ بیان کی ہے جس میں آپ (ع) فرماتے ہیں:

قال اللہ عزوجل: وعزتی وجلالی وعظمتی و بہائی وعلو ارتفاعی لا یؤثر عبد مؤمن ھوای علی ھواہ فی شئ من امر الدنیا الا جعلت غناہ فی نفسہ و ھمتہ فی آخرتہ وضمنت السمٰوٰت والارض رزقہ وکنت لہ فی وراء تجارۃ کل تاجر۔

(بحار الانوار ج ۷۰ ص ۸۲ منقول از کافی)

فرمایا اللہ عزوجل نے : مجھے اپنی عزّت وجلال، عظمت وجمال اور بلند مقام کی قسم! میرا جو بندہ بھی اپنی رضا پر میری رضا کو فوقیت دے، اسے دنیا میں بے نیاز بنا دیتا ہوں اور اس کی تمامتر کوششیں اور زحمتیں آخرت کے لئے مخصوص کر دیتا ہوں. آسمانوں اور زمین کو اس کے رزق کا ضامن قرار دیتا ہوں اور اس کے تمام منافع کا میں خود ضامن ہوں۔

بہرحال دین اسلام میں حبّ خدا کو دوسرے تمام امور پر ترجیح حاصل ہے، مؤمن کی علامت یہ ہے کہ خدا کی محبت اس کے دل کی گہرائیوں میں ہو.

اس غیر محسوس ذات کی محبت کا سرچشمہ دو چیزیں ہیں

۱۔ کمالِ خدا ، یعنی ذاتِ خدا کمالِ مطلق ہے۔ وہی ہر کامل کو کمال بخشنے والی اور ہر کمال کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ احسان اور کرم خداوندی ، یعنی خدا کا فضل وکرم اور اس کی نعمتیں ہر آن و ہر لمحہ انسان تک پہنچتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر انسان اپنے محسن، منعم اور مہربان سے محبت کرتا ہے، اسی طرح وہ انسانِ کامل سے بھی اس کے کمال کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ واجب الوجود کو جو تمام کمالات اور لامتناہی نعمتوں کا منبع اور سرچشمہ ہے، لامحالہ موحدین کا محبوب ہونا چاہیئے۔

حبِّ خدا کے آثار

حبِّ خدا کا پہلا اثر خدا کے دوستوں اور محبوبوں سے محبت ہے. خدا

کے دوست انبیاء، ائمہ علیہم السلام، اولیاء خدا، علماء ربانی اور دینِ خدا سے محبت کرنے اور اس کی نگہداشت و حفاظت کے لئے جان تک کی بازی لگا دینے والے ہیں۔ اپنے محبوب کی رضا ان کی نظر میں سب سے زیادہ شیریں اور عزیز ہوتی ہے

عاشقان کشتہ گان معشوقند
بر نیاید ز کشتہ گان آواز
اے دوست اگر جان طلبی جان بتو بخشم
از جان چہ عزیز است بگو آن بتو بخشم

وہ مجاہدین واقعی اولیاء اللہ ہیں، جو دفاعی (سرحدی) مورچوں میں کفر و الحاد اور فسق و فحشاء کے سدباب اور اسلام کی نگہداری کے لئے ہر وقت مستعد اور آمادۂ شہادت رہتے ہیں۔

حُبِ خدا کا دوسرا اثر محبوب کے وصال اور اس کی رضا کے حصول کو پوری دنیا پر مقدم سمجھنا ہے۔

نیست مارا بجز از وصل تو دیگر ہوسی
این تجارت ز متاع دو جہان مارا بس
یار با ماست چہ حاجت کہ زیادت طلبیم
دولت صحبت آن مونس جان مارا بس

حبِ خدا کا تیسرا اثر نفس کی فوری اصلاح اور باطن کی انقلابی تطہیر پر قادر ہوتا ہے۔ بعض اوقات نفس کی تدریجی اصلاح کا راستہ طولانی اور کٹھن ہوتا ہے، لیکن اگر انسان کے دِل و جان میں خدا کی محبت

موجود ہو تو اس کے باطن میں انقلابی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ فوری طور پر وہ اپنے آپ کو یادِ الٰہی والا بنا لیتا ہے اور اس خودسازی اور اصلاحِ نفس کے دوران اسے کسی قسم کی زحمت اور تکلیف بھی محسوس نہیں ہوتی۔

حبِ خدا کا چوتھا اثر خدا کے دشمنوں اور اس کے مبغوض لوگوں سے دشمنی ہے۔ قرآنِ کریم میں کفار سے محبت اہم گناہوں میں شمار ہوتی ہے نیز فعلِ حرام پر راضی ہونے کو فقہ میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

حبِ خدا کا پانچواں اثر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیروی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ

(۳: ۳۱)

(اے رسولؐ ان لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو [1]

مصائب کا خطرناک جال

ہر انسان اپنی زندگی میں بیماری، عزیزوں کی موت، مالی نقصان

---

[1] خدا، انبیاء اور ملائکہ سے دشمنی رکھنا مہلکات میں سے ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ و ملائكته و رسله وجبريل و ميكال فان الله عدو للكافرين. (۲ : ۹۸)

جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور (خاص کر) جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو بیشک خدا بھی (ایسے) کافروں کا دشمن ہے۔

جسمانی نقص، تہمت، ظلم اور محرومی جیسے خلافِ طبیعت حالات سے دوچار رہتا ہے۔ ان حالات میں شیطان کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ خالق سے انسانی رابطہ کمزور ہو جائے اور اس کے دل سے خدا کی محبت جاتی رہے۔ بلکہ بعض اوقات وہ انسان کو یہاں تک وسوسہ میں مبتلا کر دیتا ہے کہ انسان کی زبان پر حرف اعتراض آجائے اور وہ خدا کا شکوہ کرے، اور کبھی تو یہ اعتراض ایک خطرناک مرحلہ تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

خلقت من در جہان یک وصلہ ناجور بود
من کہ خود راضی باین خلقت نبودم زور بود

اس دنیا میں میری پیدائش ایک بدنما پیوند ہے میں ہرگز اپنی پیدائش پر راضی نہ تھا۔ مجھے تو زبردستی پیدا کیا گیا۔

خلق از من در عذاب من خود از اخلاق خویش
از عذاب خلق و من یا ربّ چہ ات منظور بود

میری وجہ سے مخلوقِ خدا عذاب میں مبتلا ہے اور میں خود اپنے اخلاق سے تنگ ہوں۔ پالنے والے مجھے اور دیگر مخلوق کو عذاب میں مبتلا کرنے سے تیرا کون سا مقصد پورا ہوتا ہے؟

لیکن روشن اور پاک دل موحد نظامِ ہستی کی ہر چیز کو بہتر اور بجا سمجھتا ہے۔ وہ اس جہانِ ہستی پر اس لئے خوش ہے کہ یہ جہان خدا پر خوش ہے۔

اس جانب توجہ ضروری ہے کہ ہر مصیبت اور بلا کا کوئی نہ کوئی سبب ہوا کرتا ہے۔ کسی بھی انسان پر خدا کا لطف و کرم اور مہربانی کم نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی سے خدا کو دشمنی ہے۔

ہم ذیل میں ان مصائب کے بعض علل و اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ ان مصائب کا راز و فلسفہ معلوم ہو جائے اور اللہ سے انسانی محبت کو ٹھیس نہ پہنچے اور شیطان اس مصیبت اور آزمائش کے موقع پر خدا اور انسان کے اخلاقی رابطے میں خلل نہ ڈال سکے۔

مصائب و آلام کے علل و اسباب

ا۔ بعض مصیبتیں انسان کے جرائم اور معصیتوں کی سزا کے طور پر نازل ہوتی ہیں اور مسلّماً یہ سزا، عذاب اخروی کے مقابلے میں بہت معمولی ہے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۔ (۳۰ : ۴۱)

ترجمہ: خود لوگوں ہی کے اپنے ہاتھوں کی کارستانیوں کی بدولت خشک و تر میں فساد پھیل گیا تاکہ جو کچھ یہ لوگ کر چکے ہیں خدا انکو ان میں سے بعض کرتوتوں کا مزہ چکھا دے تاکہ یہ لوگ (اب بھی) باز آجائیں۔

اس قسم کی مصیبتوں کا مقصد تطہیرِ نفس اور خطاکار انسان کی رہنمائی ہے کہ شاید ان مصائب کے بعد وہ راہِ راست پر آجائے، یہ خود ایک قسم کا لطف و کرم خداوندی ہے (جو ظاہری طور پر تو ہمارے لئے تکلیف دہ ہے لیکن باطنی اور اخروی لحاظ سے بہترین فوائد کا حامل ہے)۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا

عَنْ كَثِيْرٍ.
(۴۲ : ۳۰)

اور جو مصیبت تم پر پڑتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت سے اور (اس پر بھی) وہ بہت کچھ معاف کر دیتا ہے.

امام محمد باقر علیہ السّلام روایتِ صحیحہ میں فرماتے ہیں :

ما من نكبة تصيب العبد الا بذنب وما يعفوا الله عنه اكثر.

(اصول کافی، ج ۳ ص ۳۷۱، با ترجمہ)

انسان کی ہر بدبختی کا سبب اس کے اپنے گناہ ہیں جبکہ خداوند بندے کے اکثر گناہ بخش دیتا ہے.

۲۔ بعض مصائب اور سختیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں برداشت کرنے میں انسان کا اپنا مفاد ہوتا ہے اور جن سے بعض نقصانات کا ازالہ ہو جاتا ہے. ان مفادات اور ازالۂ ضرر کے مقابلے میں نازل شدہ مصیبت کچھ بھی نہیں ہوتی.

عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ
(۲ : ۲۱۶)

اور عجب نہیں کہ تم کسی چیز (جہاد) کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو.

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ (۹۶-۶-۷)

سُن رکھو بیشک جب انسان اپنے کو غنی دیکھتا ہے تو سرکش ہو جاتا ہے.

فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۔ (۱۸ : ۸۰)

تو ہم کو یہ اندیشہ ہوا کہ (ایسا نہ ہو کہ بڑا ہو کر) ان کو (والدین کو)

بھی اپنی سرکشی اور کفر میں پھنسا دے۔ (اس لئے ہم نے ان کے بیٹے کو ہلاک کردیا۔

مثلاً مختصر عرصے کی بیماری اس بات کا باعث بنتی ہے کہ انسان دوسرے مریضوں پر رحم کرے اور ان سے ہمدردی جتائے اور عرصۂ دراز تک اس دردِ دل کا فائدہ مختلف صورتوں میں اسے پہنچتا رہتا ہے مثلاً وہ بازاروں میں اتفاقی حادثات سے محفوظ رہتا ہے جو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

۴۔ بعض اوقات دوسروں کی نادانی اور غفلت کے نتیجے میں، انسان مصائب کا شکار ہو جاتا ہے، کیونکہ ہر فرد معاشرے کا ایک جزو ہے وہ معاشرتی برائیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، خواہ اس میں انسان کی اپنی کوئی کوتاہی ہو یا نہ ہو۔ آپ اپنے گھر اور اس کے باہر صفائی کا جتنا بھی خیال رکھیں، اگر آپ کے پڑوس یا باہر گلی میں گندگی ہو تو اس کی بدبو آپ کو ضرور آئے گی اور آپ کے بچے گلی میں کھیلتے ہوئے اس گندگی کے جراثیم سے ضرور متاثر ہوں گے۔ آپ کا بے گناہ اور بے قصور ہونا اس بدبو اور ضرر رساں جرثوموں سے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ

(۸:۲۵)

اور اس فتنہ سے ڈرتے رہو جو خاص انہی لوگوں پر نہیں پڑے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا۔

بلکہ بے گناہوں کو بھی وہ اپنی لپیٹ میں لے لے گا، البتہ روز قیامت ان بے گناہوں کو معاوضہ دیا جائے گا، جو دنیا میں گناہگاروں کی وجہ سے مبتلا ہوئے تاکہ کسی پر ظلم نہ ہو۔

بعض اوقات انسان اپنی نادانی اور غفلت کے نتیجے میں مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اگرچہ یہ غلطی گناہ نہیں ہوتی۔ یعنی انسان اپنی جہالت اور نادانی کے نتیجے میں طبیعی طور پر اپنے اعمال کے ردعمل کی زد میں آجاتا ہے۔ بلکہ کبھی انسان کی اپنی اولاد اس ردّعمل کا نشانہ بن جاتی ہے اور اسے روحانی یا جسمانی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔(۱)

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

(۳ : ۱۱۷)

اور خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے آپ اپنے پر ظلم کیا ہے۔

۴۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آفت کچھ لوگوں کے لئے تو نقصان دہ ہوتی ہے مگر مجموعی طور پر پورے معاشرے کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے اور کسی سے پوشیدہ نہیں کہ انفرادی اور اجتماعی مصلحتوں کے ٹکراؤ کی صورت میں اجتماعی مفادات کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً سخت گرمیوں میں چلنے والی ہوا جہاں ہزاروں بلکہ لاکھوں ہندوستانیوں کے لئے باعث نجات ہے وہاں اس ہوا سے کسی کی دیوار بھی گر سکتی ہے، کسی کا گھر گندہ ہو سکتا ہے، کسی کے کپڑے اڑ سکتے ہیں یا

---

(۱) بعض اوقات والدین کی غفلت اور بعض اصولوں کی مخالفت کے نتیجے میں اولاد ناقص الخلقت پیدا ہوتی ہے جس کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے (مترجم)

کسی ضعیفہ اور بیوہ کا چراغ بھی گُل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا بعض لوگوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

قضا دگر نشود با ھزار نالہ و آہ
بہ شکر یا بہ شکایت برآید از دہنی
فرشتہ ای کہ وکیل است برخزائن بادٖ
چہ غم او را کہ بمیرد چراغ بیوہ زنی

کسی کی زبان سے بطور شکر یا شکایت خواہ ہزار نالہ و فریاد نکلے اُس سے قضائے الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی جو فرشتہ قدرت کی طرف سے ہوا پر موکل ہے وہ اپنا فرض انجام دیتا ہے اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس ہوا سے کسی بیوہ کا چراغ گُل ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ سُنّت الٰہی یہ ہے کہ اسباب کا اثر مسببات میں ضرور ظاہر ہو اور مجموعی مصالح اور مفادات کے پیشِ نظر اس سنّت میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جو آگ میں گرتا ہے وہ جل جاتا ہے جو پانی میں گرے وہ ڈوب جاتا ہے۔ جراثیم سے آلودہ ہو تو بیمار پڑ جاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ میرے اور آپ کے شخصی و ذاتی مفادات کی خاطر کائنات کا عمومی نظم و نسق درہم و برہم ہو جائے۔

نمونہ کے طور پر اگر ہر مؤمن کی خاطر قانون علیت درہم برہم ہو جائے تو انبیاء علیہم السّلام کے معجزات غیر معمولی عمل نہ کہلائیں گے۔ بلکہ روزمرہ اور معمول کا کام شمار ہوں گے جس سے نبی کی نبوت ثابت نہیں ہو گی اس کے نتیجے میں آسمانی ادیان اپنی حیثیت اور اعتبار کھو دیں گے اور لادینیت عام ہونے کی وجہ سے انسانیت کے لئے اچھائیوں کی راہیں مسدود ہو جائیں گی حتّٰی کہ بشر کی خلقت کے بارے

میں سوال پیدا ہو جائے گا کہ اسے کیوں پیدا کیا گیا۔[1]

لیکن قابل توجہ بات ہے کہ ہر مصیبت زدہ کو اس کی اس مصیبت کا اجر ضرور ملے گا جو اس کی اپنی کوتاہی اور غفلت کے نتیجے میں اس پر نہ آئی ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝

(۲ : ۱۵۵)

اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے اور (اے رسولؐ) ایسے صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آپڑی تو وہ (بیساختہ) بول اٹھے ہم تو خدا ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، خوشخبری دے دو کہ انہیں لوگوں پر ان کے پروردگا کی طرف سے عنائتیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

اس بحث کے آخر میں ایک نکتہ کی طرف اشارہ نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا پر ایمان اور اس سے ربط و تعلق، عقل اور فکر

---

(۱) غور کیجئے کیونکہ یہ بات نہایت لطیف اور اہم ہے۔

کی بنیاد پر ہو تو مصیبتیں خواہ کتنی ہی بڑی ہوں، انسانی ایمان کو ضعیف اور متزلزل نہیں کر سکتیں۔ اگر خدا پر ایمان اور اس سے محبت، احساسات و جذبات کی بنیاد پر ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عافیت اور آسودگی میں تو انسان خدا کا دوست بن جاتا ہے لیکن مصیبت اور سختی کے موقع پر انسان خدا کی محبت سے دستبردار ہو جاتا ہے، کبھی تو اس کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے اور اس میں رخنہ پڑ جاتا ہے (نعوذ باللہ من ذالک) حقیقی مؤمن اور سالک کو چاہیئے کہ وہ اس خطرناک فریب سے محفوظ رہنے کی کوشش کرے۔

موحد کو محکم یقین ہونا چاہیئے کہ اس کا مالک حقیقی خدا ہے جو کبھی بھی اپنی مخلوق و مملوک کے لئے برائی نہیں چاہتا۔ وہ ہر وقت مہربان، کریم اور دوستی و پرستش کے لائق ہے۔ اس کی نعمتیں اور کمالات لامتناہی ہیں

اس سے دوستی اور محبت اس منزل پر ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے مالک سے عرض کرے: اگر تو مجھے جہنم میں ڈال دے تو میں اس عذاب پر صبر تو کر لوں گا لیکن تیری جدائی پر کیسے صبر کر سکوں گا!

"صبرت علی عذابك فكيف اصبر علی فراقك"

(دعائے کمیل)

اگر تو مجھے جہنم میں جگہ دے گا تو میں دوزخیوں کو بتاؤں گا کہ میں خدا سے محبت رکھتا ہوں۔

اللّٰھمّ اجعلنا من الذین یحبونك و تحبھم اذلة علی المؤمنین اعزة علی الکافرین۔ بمحمد وآلہ الطّاھرین۔

اے پروردگار! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو تجھ سے محبت

کرتے ہیں اور توان سے جو مومنین کے سامنے بردبار اور متواضع ہوتے ہیں اور کفار کے مقابلے میں باعظمت و باعزّت، بحق محمدؐ و آلہ الطاہرین۔

۲- یادِ خدا

قرآن مجید میں یادِ خدا کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ یہ بات نہایت واضح اور روشن ہے کہ انسان خدا کو جتنا زیادہ یاد کرے گا۔ اسے ان صفات کے حصول کی اتنی ہی توفیق نصیب ہوگی جن میں اس کی رضا ہے، اور اسی نسبت سے وہ خدا کے نزدیک ہوگا۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا۔

(۳۳-۴۱)

اے ایماندارو! بکثرت خدا کو یاد کرو۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (۱۳-۲۸)

یاد رکھو کہ خدا ہی کی یاد سے دلوں کو تسلی ہوا کرتی ہے۔

ابوعبیدہ نے امام جعفر الصادقؑ سے روایت صحیحہ بیان کی ہے جس میں آپ (ع) فرماتے ہیں:

من اشد ما فرض اللہ علی خلقہ ذکر اللہ کثیرا۔

خدا نے واجبات میں سب سے زیادہ ذکر الٰہی کی تاکید کی ہے۔

پھر مزید فرماتے ہیں:

"لا اعنی سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر

وان کان منه ولکن ذکر اللّٰہ عند ما احل اللّٰہ
و حرم فان کان طاعۃ عمل بہا وان کان معصیۃ ترکہا۔"

ذکرِ خدا سے مراد صرف سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الّا اللّٰہ واللّٰہ اکبر ہی نہیں ہے اگرچہ یہ بھی ذکرِ خدا ہے بلکہ اس سے مراد حلال و حرام کے موقع پر خدا کو اس اعتبار سے یاد کرنا ہے کہ اگر کسی عمل میں خدا کی اطاعت ہے تو اسے بجا لائے اور اگر اس میں خدا کی معصیت ہے تو اسے ترک کر دے۔[1]

جی ہاں! دل سے خدا کو یاد کرنا مسلمان کی ایک اہم صفت ہے۔ اور اس سے غفلت برتنا، شقاوت و بدبختی کا سبب ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (۱۸ - ۲۸)

اور جس کے دل کو ہم نے (گویا خود) اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش نفسانی کے پیچھے پڑا ہے اور جس کا کام سراسر زیادتی ہے اس کا کہنا ہرگز نہ ماننا۔

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (۳۹ - ۲۲)

افسوس تو ان لوگوں پر ہے جن کے دل خدا کی یاد سے (غافل ہو کر) سخت ہو گئے ہیں، یہ لوگ صریح گمراہی میں (پڑے) ہیں۔

---

[1] ص ۱۲۷، ج ۳، اصول کافی۔

مسند ابو داؤد میں رسول اللہ (ص) فرماتے ہیں:

من اکثر ذکر اللہ عزوجل احبہ اللہ ومن ذکر اللہ کثیرا کتب لہ براءتان براءۃ من النّار وبراءۃ من النفاق.[1]

جو بھی خدا کو کثرت سے یاد کرتا ہے، خدا اس سے محبت کرتا ہے۔ اور اسے آتش جہنم اور منافقت سے نجات کا پروانہ دے دیتا ہے۔

مؤمن کو چاہیئے کہ وہ اپنے گھر، دوکان، بازار، کام کرنے کی جگہ حتّٰی کہ بیت الخلاء میں بھی خدا کو یاد کرتا رہے۔ اگرچہ وہ زبان سے ذکر نہ کرے لیکن دِل میں ضرور یاد کرتا ہے۔

۳۔ اخلاص

مسلمان کو چاہیئے کہ اپنے تمام اعمال صرف قربِ خداوندی کے لئے انجام دے اور کوئی بھی عمل انجام دیتے وقت ذاتِ خدا کے علاوہ کسی کو بھی مدنظر نہ رکھے۔

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو معاملہ بھی خدا کے ساتھ انجام دے غیر خدا کو اس سے مکمل خارج کر دے یا یہ کہ انسان اپنے اعمال کو غیر خدا کے حصّے سے مکمل پاک رکھے۔

وَ اَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ فَاُوْلٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ.

(نساء: ۱۴۶)

---

[1] ص ۲۵۹، ج ۴۔ اصول کافی۔

اور اپنے دین کو محض خدا کے واسطے نرا کھرا کریں تو یہ لوگ مؤمنین کے ساتھ (بہشت میں) ہوں گے۔

وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔ (الاعراف : ۲۹)

اور اسی کے لئے نری کھری عبادت کر کے اس سے دعا مانگو۔

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔

(۹۸ : ۵)

اور انہیں تو بس یہ حکم دیا گیا تھا کہ صرف اسی کا اعتقاد رکھ کر باطل سے کترا کر خدا کی عبادت کریں۔

شرعی فرائض، مادی نفع و نقصان کی خاطر نہیں بلکہ صرف فرمان اور قانونِ الٰہی اور عبودیت کے تقاضے مدنظر رکھتے ہوئے انجام دینے چاہئیں[1]۔

برقی نے اپنی کتاب محاسن میں امام جعفر صادق علیہ السّلام سے ایک صحیح السند روایت بیان کی ہے جس میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

من احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطی للّٰہ ومنع للّٰہ فھو ممن یکمل ایمانہ۔ (ص ۲۴۸۔ ج ۷۰ بحارالانوار)

کامل الایمان شخص وہ ہے جو دوستی اور دشمنی صرف خدا کے لئے کرے، کسی کو کچھ دے تو خدا کے لئے اور اگر کسی کو محروم کرے

---

(۱) یہاں تک کہ اکثر شیعہ و سنّی دانشور ثواب کے لالچ اور عذاب کے خوف سے کی جانے والی عبادت کو باطل سمجھتے ہیں، چنانچہ شیخ بہائی فرماتے ہیں:

ذھب کثیر من علماء الخاصۃ والعامۃ الی بطلان العبادۃ اذا قصد بفعلھا الثواب ←

تو خدا کے لئے، لوگوں سے اس کے تمام ظاہری و باطنی روابط صرف اللہ کے لئے ہوں۔

فضیل کی صحیح روایت میں امام علیہ السلام سے سوال کیا جاتا ہے:

آیا حُبّ و بغض ایمان میں شامل ہے؟

امام علیہ السلام جواب میں فرماتے ہیں:

کیا ایمان حب و بغض کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے۔

(اصولِ کافی ج ۳، ص ۱۹۰)

ثمالی کی صحیح روایت کے مطابق، امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

"روز قیامت جب خداوند تمام لوگوں کو یکجا کرے گا تو منادی ندا دے گا۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو خدا کے لئے محبت کرتے تھے، یہ پکار

→

او الخلاص من العقاب، وعن الرازی اتفاق المتکلمین علی البطلان فی تفسیر قولہ ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ (الاعراف : ۵۵) لکن الحق صحۃ العبادۃ بقصد طمع الثواب او لخوف العقاب و تحقیقہ فی محل آخر

شیعہ اور اہل سنّت کے اکثر علماء کا یہ نظریہ ہے کہ حصول ثواب اور عذاب کے خوف سے انجام دی جانے والی عبادت باطل ہے چنانچہ فخر الدین رازی نے آیۃ کریمہ (وادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ) کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ ایسی صورت میں عبادت کے باطل ہونے پر علماء کا اجماع و اتفاق ہے، اس کے بعد شیخ بہائی فرماتے ہیں:

لیکن قول حق یہی ہے کہ ایسی عبادت صحیح ہے باطل نہیں۔

سن کر جب کچھ لوگ آگے بڑھیں گے تو انہیں کہا جائے گا کہ بغیر کسی حساب و کتاب اور باز پرس کے بہشت میں داخل ہو جاؤ. راستے میں فرشتے انہیں روک کر پوچھیں گے تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ جواب دیں گے ہم بغیر حساب کے جنت میں جا رہے ہیں، فرشتے پوچھیں گے تم کون ہو؟ اور دنیا میں کیا عمل سر انجام دیتے رہے ہو؟ وہ جواب دیں گے: ہم وہ لوگ ہیں جو خدا کے لئے محبت کرتے تھے اور صرف اسی کے لئے دشمنی رکھتے تھے، فرشتے کہیں گے، ان عمل کرنے والوں کا انجام کتنا اچھا ہے۔[1]

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ.

(۶ - ۱۶۲)

(اے رسولؐ تم ان لوگوں سے) کہہ دو کہ میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا خدا ہی کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہوں۔

ریا، سمعہ اور تکلف

عبادت اگر اس غرض سے بجا لائی جائے کہ لوگ دیکھیں اور سنیں بلکہ

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۹۱۔

اگر اس کا ایک حصّہ قربِ الٰہی اور ایک حصّہ دکھاوے کے لئے ہو تو بھی حرام اور باطل ہو گی، لہٰذا ضروری ہے کہ ہر مسلمان اس فعلِ شنیع سے پاک رہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ (کہف: ۱۱۰)

پس جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہونے کا آرزومند ہے اسے چاہیئے کہ عمل صالح (نیک عمل) بجالائے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

رسول اللہ (ص) نے فرمایا ہے:

"جب کچھ لوگ جہنم کی طرف لے جاتے جا رہے ہوں گے تو خدا جہنم کے داروغہ سے کہے گا، آگ سے کہنا ان کے پاؤں نہ جلائے کیونکہ یہ لوگ ان سے چل کر مساجد کی طرف جایا کرتے تھے، ان کے چہرے نہ جلائے کیونکہ یہ وضو کرتے تھے، ان کے ہاتھ نہ جلائے کیونکہ یہ انہیں دعا کے لئے بلند کرتے تھے، ان کی زبانیں نہ جلائے کیونکہ یہ ان سے قرآن بکثرت پڑھا کرتے تھے جہنم کا داروغہ ان لوگوں سے پوچھے گا کہ بدبختو! تم دنیا میں کیا کرتے رہے ہو جو تمہیں جہنم میں ڈالا جا رہا ہے؟ یہ لوگ جواب دیں گے ہم ہر کام غیر خدا کے لئے انجام دیتے تھے (کنا نعمل لغیر اللہ عزوجل)"[1]

ایک اور روایتِ صحیحہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

فاجتنبوا الریاء فانہ شرک باللہ ان المرائی یدعی یوم

---

[1] ص ۱۰۱ مقدمہ جامع الاحادیث، صحیح علی بن جعفر، عن اخیہ عن ابیہ، عن آبائہ۔

القيامة باربعة اسماء يا كافر، يا فاجر، يا غادر، يا خاسر
حبط عملك و بطل اجرك ولا خلاق لك اليوم۔[1]

ریاء سے بچو، بے شک یہ اللہ کے ساتھ شرک کے مترادف ہے، ریاء کار روزِ قیامت، کافر، فاجر، غدار اور خاسر (گھاٹے میں رہنے والا) جیسے چار ناموں کے ساتھ پکارا جائے گا اور کہا جائے گا تمہارا عمل ضائع ہوگیا اور تمہارا اجر ختم ہوگیا اور روزِ محشر میں تمہارے لئے کوئی بھلائی نہیں ہے۔

ریاء کار خود پرست ہوتا ہے نہ کہ خدا پرست، ریاکار بے عمل سے بدتر ہے۔ مثلاً اگر کوئی نماز نہیں پڑھتا تو وہ صرف واجب ترک کرتا ہے جبکہ دکھاوے کے لئے نماز پڑھنے والا نہ صرف واجب ترک کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک حرام کام بھی انجام دیتا ہے، کس قدر بدبخت ہے؟ لہٰذا روزِ قیامت اسے ان چار ناموں سے پکارا جائے گا، کافر، فاجر، غدار اور خاسر اور اسے کوئی اجر نہیں ملے گا۔

اللّٰھم انا نعوذبك من الریاء والسمعة۔

ریاء کی بحث کے آخر میں اس جانب متوجہ ہونا ضروری ہے کہ دوست کی خاطر تکلف کرنا اور روزمرہ کے رسم و رواج کا خیال رکھنا اچھی عادت نہیں ہے، اس کی مذمت میں روایات بھی موجود ہیں، چونکہ فی الحال ان روایات میں سے کوئی صحیح السند روایت نظر سے نہیں گزری

---

[1] المصدر، ص ۲۳۸، ج ۱ حدود الشریعۃ فی محرماتھا الطبعۃ الاولیٰ۔

اس لئے ان میں سے کسی کا ذکر اس کتاب میں نہیں کر رہا۔ تاہم معتبر روایات اور شارع مقدس کے ذوق و مزاج سے مجموعی طور پر یہی استفادہ ہوتا ہے کہ مسلمان کو تکلّف نہیں کرنا چاہیئے اور سادگی اور میانہ روی کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔

معاملات میں ریاکاری کی ایک قسم، تکلّف ہے۔[1] عین ممکن ہے کہ تکلّف کے دوران کسی وقت ریاء کاری سے حرام میں مبتلا ہو جائے

۴۔ یقین رکھنا

توحید و رسالت کا زبانی اقرار، قیامت پر ظاہری ایمان اور ضروریات دین میں سے کسی کا انکار نہ کرنا مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے، اگرچہ یہ اقرار شکوک و شبہات کی موجودگی میں ہو۔[2] مگر مومن وہ ہے جو زبانی اقرار کے ساتھ دل سے بھی تصدیق کرے اور مذکورہ بالا عقائد پر یقین کامل رکھتا ہو۔

۱؎ کیا صرف عبادت میں ریاء کاری حرام ہے یا معاملات میں بھی حرام ہے؟ میرے خیال میں محقق ہمدانی کے سوا فقہ میں کسی نے اس مسئلہ پر اعتراض وارد نہیں کیا۔ مصباح الفقہ ج ۱، ص ۱۱۸ میں وہ اس کے حرام ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔

۲؎ بعض علماء نے تو صرف اقرار باللسان (زبانی اقرار) کو کافی سمجھا ہے خواہ وہ دل سے انکار ہی کرے، اس لئے پیغمبر اکرم ؐ منافقین سے مسلمانوں والا برتاؤ کرتے تھے کیونکہ وہ زبان سے شہادتین کا اقرار کرتے تھے اگرچہ دل سے توحید و نبوت کے منکر تھے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ط (۴۹ : ۱۴)

عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے (اے رسول) کہہ دیجیے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ (یوں) کہو کہ ہم اسلام لائے حالانکہ ایمان کا تو ابھی تک تمہارے دلوں میں گزر ہوا ہی نہیں۔

قلبی اور باطنی اعتقاد کے بھی مراتب و درجات ہیں۔ شاید ان میں سے پست ترین درجہ قلبی اور بلند ترین درجہ یقین ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ. (۱۵ : ۹۹)

اپنے پروردگار کی عبادت کرو تاکہ تمہیں یقین حاصل ہو جائے۔

دو صحیح السند روایتوں میں امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: تقویٰ کا مقام ایمان سے اور یقین کا مقام تقویٰ سے بلند ہے، اور یقین سے کم کوئی چیز لوگوں میں تقسیم نہیں ہوئی۔" (یعنی یقین بہت کم تقسیم ہوا ہے)۔[۱]

خناط اور ابن سنان کی روایاتِ صحیحہ میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

من صحة يقين المرء المسلم ان لا يرضى الناس بسخط الله ولا يلومهم على ما لم يؤته الله فان الرزق لا يسوقه حرص حريص .... ان الله بعدله وقسطه جعل الروح والراحة فى اليقين و جعل الهم و الحزن فى الشك والسخط.[۲]

---

[۱] اصول کافی، ج ۳، ص ۸۸

[۲] ص ۹۵، ج ۳، اصول کافی

اس روایت میں یقین کے اثرات میں سے تین کا ذکر کیا گیا ہے:
۱۔ لوگوں کی رضا و خوشنودی کی خاطر خدا کو غضبناک نہ کرے (یعنی لوگوں کی خوشی کے لئے خدا کی نافرمانی نہ کرے)۔
۲۔ جو کچھ خدا نے لوگوں کو دیا ہے اس پر ان کی ملامت نہ کرے۔
۳۔ پرسکون رہے کیونکہ غم واندوہ، شک و شبہ اور ناراضگی میں سے ہے۔
صحیح ہشام میں روایت ہے کہ وہ قلیل عمل جو ہمیشہ یقین کے ساتھ انجام دیا جائے خدا کے نزدیک اس کثیر عمل سے بہتر ہے جو بغیر یقین کے انجام دیا جائے[1]۔
جمال کی روایتِ صحیحہ میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:
لا یجد عبد طعم الایمان حتی یعلم ان ما اصابه لم یکن لیخطئه وان ما اخطأه لم یکن لیصیبه وان الضار النافع هو الله[2]
"کوئی بھی بندہ ایمان کا مزہ اس وقت تک نہیں چکھ سکتا جب تک وہ یہ عقیدہ نہ رکھے کہ جو کچھ اسے پہنچا ہے وہ ٹل نہیں سکتا اور جو کچھ اس تک نہیں پہنچا وہ پہنچ ہی نہیں سکتا تھا اور نفع ونقصان صرف خدا کی جانب سے ہے۔"
لیکن یہ بات قابل توجہ اور نہایت اہم ہے کہ حوادث ومشکلات میں سینہ سپر رہنا مفادات کا تحفظ اور نقصانات سے بچاؤ کی تدابیر کرنا انسان کا

---

[1] ص ۹۶، ج ۳۔ اصول کافی۔
[2] ص ۹۷، ج ۳۔ اصول کافی۔

فرض ہے لیکن جب انتہائی تگ و دو کے باوجود ان مشکلات پر قابو نہ پا سکے تو پریشان یا دل برداشتہ نہ ہو بلکہ یہ خیال کرے کہ ایسا ہونا ہی تھا۔

ایک اور روایتِ صحیحہ میں دیوار کے نیچے خزانہ (وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِى الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِىْ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا۔ کی طرف اشارہ ہے) کی تفسیر کرتے ہوئے معصومؑ فرماتے ہیں:

لَا اِلٰہَ اِلَّا انا من ایقن بالموت لم یضحک سنہ و من ایقن بالحساب لم یفرح قلبہ و من ایقن بالقدر لم یخش الا اللّٰہ[1]

میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ جسے موت پر یقین ہے وہ کبھی ہنس نہیں سکتا اور جسے حشر و نشر اور حساب و کتاب کا یقین ہے اس کا دل خوش نہیں ہو سکتا اور جسے قضا و قدر پر یقین ہے وہ غیر خدا سے خوف نہیں کھا سکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ جو انسان ظاہر و باطن سے ذات باری تعالیٰ، اس کی عظمت و جلال، رحم، قہر و قدرت، لامتناہی نعمتوں اور اس کے دردناک عذاب پر یقین رکھتا ہے حتماً اس درجہ پر فائز ہو گا جس کا ذکر گزشتہ روایت میں ہوا ہے۔

---

[1] ص ۹۷، ج ۳، اصول کافی۔

جی ہاں! مذکورہ روایت کے مطابق یقین پر اعتماد رکھنے والے کے جو تاثرات ہیں وہ اندھی تقلید پر اعتقاد رکھتے اور کمزور عقیدہ رکھنے والے کے نہیں ہو سکتے۔

لہٰذا سب سے پہلے یقین حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور یہ یقین دو طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اسلامی علوم و معارف اور مبداء و معاد پر غور و فکر کرنے سے

۲۔ عبادت کرنے سے۔

البتہ یقین بلاواسطہ عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اسلامی معارف و علوم اور مبداء و معاد پر غور و فکر کرنا اس کے مقدمہ اور تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ (۱۵-۹۹)

اختتامیہ:

قرآن مجید میں حق الیقین کا دو مرتبہ اور علم الیقین اور عین الیقین کا ایک مرتبہ ذکر ہوا ہے۔ ایک احتمال یہ ہے کہ تینوں عبادتوں میں حق، علم اور یقین کے الفاظ "یقین" کی تاکید کے لئے استعمال کئے گئے ہیں (یعنی ان تینوں میں کوئی فرق نہیں ہے) لیکن بعض دانشمند علم الیقین کو وہ علم قرار دیتے ہیں جو دلیل سے ثابت ہو مثلاً دھواں دیکھ کر آگ کا علم ہو جانا، حق الیقین ان کے نزدیک وہ علم ہے جو مشاہدہ سے حاصل ہو مثلاً آگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور عین الیقین وہ ہے کہ جو قوت لامسہ کے ذریعے حاصل

ہو مثلاً انسان خود آگ میں داخل ہو جائے اور پھر اسے آگ کا علم ہو.

چنانچہ ایک معتبر روایت میں ہے:

لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ (۱۰۲ : ۵) اگر تمہیں یقینی طور پر معلوم ہوتا کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

علم الیقین سے مراد معائنہ و مشاہدہ ہے[1]

یقین کے اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ قبول اسلام سے قبل کے گناہ بے اثر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ابی عبیدہ کی ایک صحیح روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

لوگوں کی ایک جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ کیا ہمیں ان گناہوں کی سزا بھی ملے گی جو ہم سے زمانۂ جاہلیت (حالت کفر) میں سرزد ہوئے؟ آپؐ نے فرمایا:

جس کا اسلام مضبوط اور ایمان پر یقین کامل ہو خداوند اس کے گزشتہ کردار کا مواخذہ نہیں فرمائے گا اور جس کا اسلام کمزور اور ایمان پر یقین ناپختہ ہوگا خداوند اس کے گزشتہ اور آئندہ گناہوں کا مواخذہ فرمائے گا۔

ومن سخف اسلامه ولم یصح یقین ایمانه اخذه الله تبارک وتعالی بالاوّل والآخر[2]

---

[1] بحار الانوار، ج ۷، ص ۱۷۶۔

[2] ص ۲۰۱ و ص ۲۰۲، ج ۴ اصول کافی۔

۵۔ توکل بخدا

روزمرّہ امور میں خداوندکریم پر اعتماد اور ہر کام خدا کے سپرد کرنے کا نام توکل ہے اور فقہی اعتبار سے یہ واجب ہے۔

ایک معتبر روایت میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام آیۂ وَ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ۔ یعنی "اور جو شخص خدا پر توکل کرے تو وہ اس کے لئے کافی ہے۔" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خدا پر توکل کرنے کے کئی درجے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر کام میں خدا پر توکل کرو اور اپنے بارے میں خدا کے ہر فیصلے پر راضی رہو۔"

توکل ان صفات میں سے ایک ہے جس کی تاکید قرآن مجید نے متعدد بار کی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔

(۸ : ۲)

سچے ایماندار تو وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور بھی زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ لوگ بس اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ۔

(۳ : ۱۵۹)

جب کسی کام کی ٹھان لو تو خدا ہی پر بھروسہ رکھو (کیونکہ) جو لوگ

خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں خدا ان کو ضرور دوست رکھتا ہے۔"

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۔
(۱۰ : ۸۴)

اگر تم (سچے دل سے) خدا پر ایمان لا چکے اور فرمانبردار ہو تو بس اسی پر بھروسہ کرو۔

توکل پر ایک بحث

توکل اور اسباب کے ذریعے مسببات کی تلاش و کوشش میں کوئی تضاد نہیں ہے اور اسلام نے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اسباب حاصل کریں لہٰذا ارشاد ہوتا ہے:

"(جب عقلی اصولوں کے مطابق) کوئی فیصلہ کرلو تو خدا پر توکل کرو۔"

حاصل کلام یہ ہے کہ اسباب ترک کردینا توکل نہیں ہے بلکہ استقلال اسباب کی نفی کرتے ہوئے ارادۂ پروردگار جو کہ مسبب الاسباب ہے پر صحیح طور پر اعتماد و بھروسہ کرنا توکل ہے۔ مثلاً قرآن حکیم کے حکم کے مطابق مسلمان کو چاہیئے کہ کفار کے شر سے بچنے کے لئے اپنی تمام تر طاقت و توانائی اور صلاحیتیں بروئے کار لائے اور اسلحہ سے لیس ہو، لیکن کامیابی کے لئے اس طاقت اور اسلحہ پر بھروسہ نہ رکھے کیونکہ وہ خدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۳ : ۱۲۶)

اور (یہ ظاہر ہے کہ) مدد جب ہوتی ہے تو خدا ہی کی طرف سے۔

توکل اس لئے ہے کہ کہیں اسباب کی طرف توجہ خدا اور انسان کے درمیان ارتباط کمزور نہ کردے بہ یقین رکھنا چاہیئے کہ خدا کسی بھی سبب کو اس سے طاقتور سبب کے ذریعے بے اثر کرنے پر قادر ہے اور ہر چیز اس کے حکم سے وقوع پذیر ہوتی ہے نیز ظاہری اسباب (اگرچہ وہ خدا کی مخلوق اور مقدر ہوں) مستقل طور پر مسببات کو پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔[1]

توکل کے فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس سے یہ شک و تردد دور ہو جاتا ہے کہ انسان کے فیصلوں پر عمل درآمد ہو سکتا ہے۔

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳: ۱۵۹)

بعض اوقات کسی بھی کام جیسا کہ بارش ہے کے اسباب انسان کی قدرت و اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ اس صورت میں صرف توکل کا راستہ اپنانا صحیح اور معقول ہوتا ہے کبھی اسباب اختیاری اور مقدور ہوتے ہیں لیکن سعی و کوشش کے بعد۔ البتہ ان اسباب کی تاثیر کبھی قطعی و یقینی اور کبھی ظنی ہوتی ہے اور کبھی تو صرف تاثیر کا احتمال ہوتا ہے یہ احتمال بھی کبھی عاقلانہ ہوتا ہے اور کبھی غیر معقول۔

اخلاق کے موضوع پر لکھی جانے والی بعض کتب میں توکل کے تین درجے بیان

---

[1] غلط فہمی نہ ہو کہ اس سے مراد علل مادی کی علیت تامہ کا انکار ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ علل مادی کو مستقل حیثیت حاصل نہیں ہے اور دوسرے اور طاقتور علل سے ٹکراؤ کا امکان ہے، جو ان علل کو بے اثر بنا سکتے ہیں۔

کیئے گئے ہیں۔

۱۔ انسان کا خدا پر ایسا اعتماد اور بھروسہ ہو جیسا وکیل پر ہوتا ہے! توکل کا درجہ کثیر الوقوع ہے، یعنی زیادہ تر دیکھنے میں آتا ہے اور ہمیشہ بھی رہ سکتا ہے، اس کے علاوہ یہ قانونِ تدبیر، تدبیرِ عالم کے منافی بھی نہیں۔

۲۔ بندے کے کام خدا سے اس طرح وابستہ ہوں کہ جس طرح ایک شیر خوار بچے کے کام اپنی ماں سے وابستہ ہوتے ہیں۔

توکل کے ان دونوں درجوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے درجے میں بندہ اپنے توکل کی طرف متوجہ اور ملتفت رہتا ہے لیکن دوسرے درجے میں صرف متوکل علیہ (جس پر توکل کیا جائے) کی طرف ملتفت ہوتا ہے اور متوکل یعنی توکّل کرنے والا اپنے توکل کا احساس نہیں کرتا۔

توکل کی یہ قسم ایک دو دن سے زیادہ باقی نہیں رہ سکتی اور اصل تدبیر کے منافی بھی ہے مگر یہ کہ دعا اور گریہ وزاری کے ذریعہ خدا کی طرف رجوع کیا جائے تاکہ تدبیر عالم کے قانون پر عمل ہو جائے۔

۳۔ بندہ خدا کے سامنے اس طرح رہے کہ جیسے غسّال[1] کے ہاتھوں میں میت ہوتی ہے اور یہ دعا تک نہیں کرتا۔ توکل کی اس حالت میں متوکل کی زبانِ حال یہ ہوتی ہے

اربابِ حاجتیم و زبان سوال نیست
درحضرت کریم تمنّا چہ حاجت است

---

[1] میت کو غسل دینے والا

توکل کے اس درجے پر صرف صدیقین ہی فائز ہو سکتے ہیں جن کا اسباب ظاہری پر اعتماد بالکل ختم ہو چکا ہوتا ہے اور وہ خدا کے علاوہ کسی کو بھی موثر نہیں سمجھتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ

ہر چیز اس کے ارادے کے سامنے بے بس اور اس کے فیض کی ایک جھلک ہے۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسبب الاسباب اور ذات حکیم کس حد تک اپنے بندوں کی وکالت قبول کرتی ہے اور اس نے انہیں توکل کی اجازت دی ہے تاکہ اس حد سے زیادہ توکل کو بے کاری، سستی بلکہ حماقت تصوّر کیا جائے

قرآنِ کریم اور سنّت میں عقلی اسباب حاصل کرنے اور کدو کاوش کی تاکید و تلقین کی گئی ہے، خاص کر آیۂ کریمہ:

وَ اَنْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (۵۳-۳۹)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

اور قطعی تجربات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خداوند کریم توکل کے صرف درجۂ اوّل کی اجازت دیتا ہے اور اسی کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

توکل کا دوسرا اور تیسرا درجہ تخیّل پرداز لوگوں کی پیداوار ہے اسلامی اخلاقیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے جب تک اونٹ کے گم ہو جانے کے ڈر سے اس کے پاؤں نہ باندھے جائیں اس کی حفاظت کے بارے میں خدا پر توکل بے کار ہے۔ لیکن اونٹ کے پاؤں باندھنے کے

بعد مغرور بھی نہیں ہونا چاہیئے[1] کیونکہ ظاہری اسباب کا آپس میں تصادم و ٹکراؤ بھی تو ممکن ہے اور آخری اثر اسی سبب اور علت کا ہوگا جو سب سے قوی اور جو مسبب الاسباب ہے قوی سے قوی تر اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ (غور کیجئے)۔

۶۔ تفویض

یعنی ہر کام خدا کے سپرد کرنا، شاید تفویض کا معنی توکل سے زیادہ قریب ہو، اس لئے قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر وہ بھی مؤمن آل فرعون کی زبانی اس کا ذکر آیا ہے:

وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۔

(۴۰ : ۴۴)

اور میں تو اپنا کام خدا ہی کو سونپے دیتا ہوں، کچھ شک نہیں کہ خدا بندوں کے حال کو خوب دیکھ رہا ہے۔

لیکن رضائے خداوندی کی بحث میں چند روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تفویض کے معنی توکل سے کچھ مختلف ہیں۔

۷۔ تسلیم بہ خدا

ہر فیصلہ پر سر تسلیم خم کرنا۔

---

[1] کہ اب اسے کوئی خطرہ نہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۴-۶۵)

خدا کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں کہلا سکتے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں تیرا فیصلہ تسلیم نہ کریں پھر یہ فیصلہ سن کر دل میں ناراضگی بھی محسوس نہ کریں اور دل و جان سے تیری قضاوت تسلیم کریں۔

اوامر الہٰی اور احکام اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لئے خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت ضروری ہے اور ان سے بچنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ مؤمنین کرام اس آیۂ کریمہ میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر فرمائیں، کیونکہ صرف ظاہری عمل کافی نہیں ہے بلکہ تسلیم نفس بھی ضروری ہے خدا ہمیں اس کی توفیق عنایت فرمائے۔

وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔ (۳۳-۲۲)

اور ان کا ایمان اور ان کی اطاعت اور بھی زیادہ ہو گئی۔

بہر حال خدا و رسول کے فیصلے کے بعد کسی بھی صاحب ایمان مرد و عورت کا اختیار باقی نہیں رہتا بلکہ سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔ سورۂ احزاب آیۂ ۶ میں غور فرمائیں۔

میرے ہمعصر علماء کرام میں سے ایک صاحب فرمایا کرتے تھے جب انسان خدا کی رضا نہ چاہے اور اس کے مقدرات کو تسلیم نہ کرے تو وہ بہت سے بندوں کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ذلت کی حالت

میں ان کی خوشنودی کے حصول میں کوشاں رہتا ہے۔

جو شخص خواہشاتِ نفسانی کو ہی اپنا معبود تصوّر کرے تو وہ گھٹیا انسانوں کی بندگی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر خدا کے سامنے تواضع اختیار نہ کی جائے تو لامحالہ دوسروں سے ذلت اٹھانا پڑتی ہے آزادی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ مالک حقیقی کے سامنے جھکا جائے۔

احکامِ خداوندی پر تسلیم و رضا کے آثار میں سے ایک اثر یہ ہے کہ غیر خدا کے سامنے مسائل کی شکایت نہ کی جائے۔ حضرت یعقوبؑ فرماتے ہیں:

اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ (۱۲-۸۶)

میں اپنی بیقراری اور رنج کی شکایت صرف خدا سے کرتا ہوں۔

اس آیۂ شریفہ کی تفسیر میں جناب جابر حضرت امام باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:

کسی راہب نے حضرت یعقوبؑ سے پوچھا آپ تو جوانی میں بھی بوڑھے نظر آ رہے ہیں۔ حضرتؑ نے جواب دیا: یہ ان مصائب و آلام کا اثر ہے جن میں مبتلا ہوں۔ ابھی راہب گھر کے دروازے سے کچھ ہی دُور گیا تھا کہ آپ پر وحی ہوئی: یعقوبؑ تو بندوں کے سامنے میری شکایت کر رہا ہے۔ یہ بات سن کر حضرتؑ سجدے میں گر گئے اور عرض کیا: میرے مالک آئندہ ایسا کام نہیں کروں گا۔ وحی نازل ہوئی: ہم نے تمہیں بخش دیا۔

چونکہ میری نظر میں اس روایت کی سند مشکوک ہے اس لئے ساری روایت نقل نہیں کی۔[1]

---

[1] تفسیر برہان، ج ۲/ ص ۲۶۲۔

حقیقت یہ ہے کہ بلائیں اور مصیبتیں مؤمن سے جدا نہیں ہو سکتیں، لہٰذا اسے چاہیئے کہ انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہے چنانچہ روایت میں مذکور ہے:

سئل رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم) من اشد الناس بلاء فی الدنیا؟ فقال النبیون ثم الامثل فالامثل ویبتلی المؤمن بعد علی قدر ایمانہ وحسن اعمالہ، فمن صح ایمانہ وحسن عملہ اشتد بلائہ ومن سخف ایمانہ وضعف عملہ قل بلائہ.

ترجمہ: پیغمبر اکرم (ص) سے پوچھا گیا: دنیا میں سب سے زیادہ آزمائشوں میں کون مبتلا ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے اس کے بعد ان افراد کی جو فضیلت میں انبیاء کے بعد ہیں، اس ترتیب سے مؤمن قوتِ ایمان اور حسن عمل کی بدولت مصائب میں مبتلا ہوتا رہتا ہے جس کا ایمان صحیح اور عمل نیک ہو اس کی مصیبت میں سختی ہوتی ہے اور جس کا ایمان ناقص اور عمل کم ہو اس کی آزمائش بھی قلیل ہوتی ہے.

ایک اور صحیح روایت میں معصومؑ فرماتے ہیں:

جنت میں ایک مقام ایسا ہے جہاں وہی آدمی پہنچ سکتا ہے جو جسمانی بیماریوں کی آزمائش سے گزرا ہو۔[1]

ایک اور صحیح روایت میں امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

المؤمن لا یمضی علیہ اربعون لیلۃ الا عرض لہ امر یحزنہ

---

[1] ص ۹۰۶، ج ۲، الوسائل.

یذکر به[1]

ترجمہ: مؤمن ہر چالیس دن بعد ضرور کسی نہ کسی المناک آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

۸۔ رضائے خدا

انسانی نفس کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے راضی رہے، چنانچہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ شیریں اور دل نشین جملہ مذکور ہے۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ وَرَضُوْا عَنْہُ

خدا ان (مسلمانوں) سے وہ خدا سے راضی ہوئے۔

یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔ (۸۹ - ۲۸)

اے نفسِ مطمئنہ ایسی حالت میں اپنے ربّ کی طرف رجوع کر کہ تو اپنے ربّ سے راضی اور ربّ تجھ سے راضی ہو۔

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

" ایمان اسلام سے، تقویٰ ایمان سے اور یقین تقویٰ سے بالاتر ہے، جو چیز لوگوں میں سب سے کم تقسیم کی گئی، وہ یقین ہے، راوی نے پوچھا: مولا یقین کس چیز کا نام ہے؟ فرمایا: جب انسان خدا پر توکل رکھے خدا کے سامنے تسلیم ہو جائے، اسکی

---

[1] ص ۹۰۷، ج ۲، الوسائل۔

قضا پر راضی ہو اور ہر کام اُس کے سپرد کردے"۔
ایک اور روایت میں امام رضا علیہ السلام اپنے آباؤ اجداد سے روایت فرماتے ہیں:

رسول اکرمؐ کے زمانے میں ایک جنگ کے موقع پر آنحضرتؐ کی خدمت میں کچھ لوگ لائے گئے، آپؐ نے فرمایا: یہ کون لوگ ہیں؟ جواب دیا گیا: یہ مؤمن ہیں۔ آپؐ نے ان سے پوچھا: تمہارا ایمان کس درجہ تک پہنچا ہے، عرض کیا: ہم ایمان کے اس درجے پر فائز ہیں جہاں ہم مصیبت کے موقع پر صبر، نعمتوں اور آسائش کے موقع پر شکر اور قضائے الٰہی پر تسلیم و رضا کا اظہار کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: یہ لوگ حلیم، بردبار اور عالم ہیں۔ یہ اپنے وافر علم کی بدولت اس درجہ پر فائز ہیں جو انبیاء علیہم السّلام کے درجات کے زیادہ قریب ہے، اگر تم واقعاً اس درجہ پر فائز ہو جس کا تم نے ذکر کیا ہے تو ایسی جگہ محلّات تعمیر نہ کرو جہاں تمہیں رہنا نہیں، اس چیز کا ذخیرہ نہ کرو جو تم نے کھانی نہیں۔ اس خدا سے ڈرو (یعنی اس کی عدالت سے) جس کی طرف تمہاری بازگشت ہے۔ [1]

افعالِ خداوندی کی علّت و سبب کے چار اجزاء (مشیّت، ارادہ، تقدیر اور قضا) میں سے آخری جز یہی قضا ہے جس کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔

ناگوار حادثات پر راضی نہ ہونا قضائے الٰہی پر راضی نہ ہونے کے منافی

---

[1] اصول کافی، ج ۳/ ص ۸۱۔

نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ایک حادثہ (المیہ) سے ہم اس لئے کراہت محسوس کریں کہ یہ ہماری طبیعت سے سازگار نہیں۔ اور (مادی اعتبار سے) نقصان دِہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ خدا کی مرضی اور پسند پر مشتمل اس کا حکم ہے لہٰذا ہم بھی اس پر راضی ہیں۔

علامہ حلّی علیہ الرحمۃ نے قضائے الٰہی پر راضی ہونے کے وجوب پر علماء امامیہ کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ دعویٰ اگرچہ راقم الحروف کی نظر میں صحیح نہیں تاہم قضائے الٰہی پر غضبناک ہونا (برہمی کا اظہار کرنا) فقہی نقطۂ نگاہ سے حرام ضرور ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

"اطاعت الٰہی کی بنیاد خدا کے ہر کام پر راضی ہونا ہے خواہ ہم اس کام کو دل سے چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں۔"

خداوند عالم اپنے بندوں کے حق میں جو کام بھی انجام دیتا ہے اس میں بندے ہی کی بھلائی ہوتی ہے۔

امام صادق علیہ السّلام روایت صحیحہ میں فرماتے ہیں۔

رأس طاعۃ اللہ الرضا بما صنع اللہ فیما احب وفیما یکرہ (ولم یصنع اللہ لعبد شیئاً) الا وھو خیر لہ[1]

اطاعت خدا کا سرچشمہ یہ ہے کہ انسان خدا کے ہر فعل (خواہ یہ بندے کو پسند ہو یا بندہ اس سے نفرت کرتا ہو) پر راضی رہے اور خدا اپنے بندے کیلئے وہی کام انجام دیتا ہے جس میں اس کی بھلائی ہے۔

---

[1] ص ۱۳۹، ج ۷۱، بحار الانوار۔

۹۔ شکر گزاری

شکر خدا کے بارے میں بہت سی آیات و روایات وارد ہیں۔ بطور نمونہ ان میں سے چند ایک پیش خدمت ہیں:

كُلُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ. (۲: ۱۷۲)

خدا کے دیئے ہوئے پاک و پاکیزہ رزق میں سے کھاؤ اور اس کا شکر بجا لاؤ اگر تم عبادت گزار ہو۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (۱۴-۷)

تم میرا شکر بجا لاؤ تو میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔

وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ. (۱۶-۱۱۴)

اگر تم خدا کی پرستش (کا دعویٰ) کرتے ہو تو اس کی نعمت کا شکریہ ادا کیا کرو۔

وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (۳۱-۱۲)

جو آدمی بھی شکر بجا لاتا ہے وہ اپنے ہی فائدے کے لئے بجا لاتا ہے اور کفرانِ نعمت اختیار کرے تو خدا بے نیاز اور قابل تعریف ذات ہے۔

صحیح معمر میں حضرت ابو الحسن علیہ السلام فرماتے ہیں:

من حمد الله علی النعمة فقد شکره وکان الحمد افضل من تلك النعمة.

جو خدا کی نعمتوں پر اس کی حمد بجا لائے گویا کہ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور حمد بجا لانا نعمت سے زیادہ افضل ہے۔

صحیح الجمال میں حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ما انعم اللہ علی عبد بنعمۃ صغرت او کبرت، فقال الحمد للہ الا ادی شکرھا۔[1]

اگر خدا کسی بندے کو چھوٹی یا بڑی نعمت سے نوازے اور بندہ الحمد للہ کہے تو وہ خدا کا شکر بجا لایا ہے۔

حمد اور شکر کے بارے میں بے شمار روایات وارد ہوئی ہیں، چنانچہ مرحوم کلینی نے کتاب کافی میں تیس روایات نقل کی ہیں۔ کثرت روایات اس بات کی شاہد ہیں کہ مؤمن کو ہمیشہ شکر گزار رہنا چاہیئے اور شیطانی وسوسوں سے بھی ہوشیار رہنا چاہیئے۔

الحمد للہ کما ھو اھلہ، الحمد للہ عدد ما فی علمہ۔

شکر کی تفسیر

راغب اپنی مفردات میں لکھتا ہے:

"شکر کسی بھی نعمت کے تصوّر اور اظہار کا نام ہے"[2]

کہا جاتا ہے، شکر "کشر" کا مقلوب (تبدیل شدہ) ہے جس کے معنی کشف اور ظاہر کرنا ہے اور شکر کی ضد کفر ہے جس کے معنی کسی نعمت کو

---

[1] ص ۳۱ و ص ۳۲، ج ۱۷ بحار الانوار۔

[2] قال اللہ تعالیٰ: وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ۔ دین خدا اور اس کی عطا کردہ نعمتوں کا ذکر کرتے رہو۔ موثقۃ البقباق، ص ۹۴، ج ۳، اصول کافی۔

فراموش کر دینا اور چھپا دینا ہے۔

محقق طوسی فرماتے ہیں:

"شکر یہ ہے کہ گفتار، رفتار، کردار اور نیت سے کسی نعمت پر ردعمل ظاہر کیا جائے۔"

شکر کے تین ارکان ہیں:

۱۔ منعم، اس کی صفات اور نعمتوں کی معرفت حاصل کی جائے۔

۲۔ نعمت کے مقابلے میں خشوع وخضوع اور مسرت کا اظہار کیا جائے، اور اسے منعم کی طرف سے گراں بہا تحفہ تصور کیا جائے جو اس کی عنایت جود و سخا پر واضح دلیل ہے۔

۳۔ ایسے کام سے خوشی حاصل ہو جو منعم کی قربت کا سبب بنے اس کام کا تعلق دل و زبان اور اعضاء سے ہو۔[۱]

المنجد میں مذکور ہے:

شکر شکرا و شکورا الرجل ولہ (وباللام افصح): اثنی علیہ... شکر اللہ سعیک ای اثابک... تشکر لہ بمعنی شکر لہ... الشکور الکثیر

---

[۱] عائشہ رض نے رسول اللہ ص سے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ اپنے آپ کو کیوں زحمت میں ڈال رہے ہیں، جبکہ خدا نے آپ کے گزشتہ اور آیندہ کے گناہ (ترکِ اولیٰ) بخش دیئے ہیں، آپ ص نے فرمایا: ٹھیک ہے میں معصوم عن الخطاء ہوں لیکن کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ (اصول کافی، ج ۳، ص ۱۵۰) اس حدیث کی سند میں وہب ابن حفص ہے جسکی صداقت ثابت نہیں۔

الشکر الشکور فی اسمائہ تعالیٰ المعطی الثواب الجزیل.

یعنی "شکر الرجل شکر للرجل کا معنی یہ ہے کسی کی تعریف و ثنا کرنا شکر اللہ سعیک یعنی خدا تجھے ثواب دے، خدا کے اسماء میں سے ایک شکور ہے جس کا معنی ثواب کثیر دینے والا ہے۔"

ظاہری طور پر صاحب المنجد کا کلام صحیح ہے اور آیات و روایات میں جس شکر کا ذکر ہے، اس کا لغوی اور اصطلاحی معنی ثنا و تعریف کرنا ہے، جب انسان کہے کہ خدا کا شکر ہے تو اس سے شکرِ نعمت ہو جاتا ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ الحمد للہ کہہ کر شکر بجا لایا جائے، البتہ انسان کو چاہیئے کہ پہلے نعمتِ الٰہی کو قدر کی نگاہ سے دیکھے، اسے منعمِ حقیقی کی نعمت سمجھے پھر الحمد للہ کے ذریعے شکر بجا لائے

شکر کا کامل درجہ یہ ہے کہ انسان عملی طور پر منعم اور مشکور کو راضی رکھے اور اس کی نعمتیں اسی کی رضا اور خوشنودی کی راہ میں خرچ کرے، بہرحال اس مقام پر دو مطالب قابلِ غور ہیں:

۱۔ آیا شکر زبانی تعریف کے بغیر ادا ہو سکتا ہے؟ یا تلفظ بھی ضروری ہے؟

۲۔ شکرِ خدا واجب شرعی ہے یا نہیں؟

میرے خیال میں فقہاء میں سے کسی نے شکر کو واجب قرار نہیں دیا کچھ آیات مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت ۱۷۲ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شکر واجب ہے البتہ شکر بمعنی ثناء اور اظہارِ نعمت کے نہ کہ شکر بمعنی ایمان. عقل عملی شکر منعم کو واجب گردانتی ہے[1] میں اسے حسن و قبح عقلی کی بنیاد پر تسلیم کرتا ہوں.

---

[1] لیکن خدا کے علاوہ دوسرے منعمین کے لئے صحیح نہیں کہ وہ منعم علیہ ←

بہر حال شکر گزاری کے مراتب سے ایک مرتبہ یہ ہے کہ خدا کی نعمتیں بیان کی جائیں انہیں چھپایا نہ جائے۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۔ (۹۳ : ۱۱)

۱۰۔ خشوع و خضوع

قال اللہ تعالیٰ: اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ ...[۱]

کیا مؤمنین کے لئے وہ وقت نہیں آیا؟ کہ ان کے دل یادِ خدا اور اس کی نازل کردہ چیزوں کے لئے خاشع ہوں (پگھل جائیں) اور وہ ان لوگوں کی مانند نہ ہو جائیں جن کو ان سے پہلے کتاب (توریت و انجیل) دی گئی تھیں، جب ایک زمانہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں۔

وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا۔[۲]

وہ روتے ہوئے منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور (قرآن کا سننا) ان کے خضوع و خشوع کو بڑھا دیتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔[۳]

← (احسان مند) سے شکر گزاری کی خواہش یا توقع رکھیں، کیونکہ یہ احسان جتلانے کے مترادف تصور ہوگا بلکہ بعض اوقات اسکا مقصد دوسرے کو اذیت دینا ہوتا ہے

۱۔ الحدید : ۱۶۔ ۲۔ اسریٰ : ۱۰۹

۳۔ المؤمنون : ۱-۲۔

"وہ اہل ایمان کامیاب ہیں، جو حالت نماز میں خشوع رکھتے ہیں۔"

راغب کہتا ہے:

"خشوع بمعنی ضراعت و تضرع ہے اکثر اوقات خشوع اعضاء و جوارح اور خضوع دل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔"

لیکن پہلی دو آیتوں میں خشوع، نفس کے لئے استعمال ہوا ہے بلکہ ظاہراً آخری آیۃ میں خشوعِ نفس مراد ہے جو اعضاء و جوارح تک میں سرایت کئے ہوئے ہو۔

ظاہری طور پر خشوع و خضوع سے مراد خدا کے سامنے تواضع، فروتنی اور بے بسی ہے، جس سے نماز کا حسن بڑھ جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السّلام سے روایت ہے:

انّ فی السّماء ملکین موکلین بالعباد فمن تواضع للّٰه رفعاه من تکبر وضعاه[1]

یعنی،

"آسمان میں دو فرشتے ہیں جو لوگوں پر موکّل ہیں جو شخص خدا کی خاطر تواضع اور فروتنی سے کام لے فرشتے اس کا مقام بلند کر دیتے ہیں۔"[2]

صحیحہ عبد الرحمٰن میں امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

---

[1] ص ۱۸۵، ج ۳ اصول کافی۔

[2] ممکن ہے کہ اس سے مراد رضائے خدا کی خاطر لوگوں سے تواضع رکھنا ہو، البتہ خدا سے تواضع رکھنے کا ذکر بعد والی روایت میں ہے۔

"بروز جمعرات رسولؐ خدا افطار کے موقع پر مسجد قبا میں تھے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا پینے کے لئے کوئی چیز میسر ہے۔ اس دن اوس بن خولی الانصار نے دودھ، بالائی اور شہد آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے اسے دہن مبارک سے لگایا اور پھر ہٹا لیا۔ اور فرمایا: یہ تو دو چیزیں ہیں ایک کے ذریعے دوسری سے بے نیاز ہوا جا سکتا ہے اسے پیتا بھی نہیں اور حرام بھی قرار نہیں دیتا' لیکن خدا کی تواضع سے کام لوں گا جو بھی خدا کے لئے تواضع اختیار کرے وہ اسے بلند مرتبہ عطا فرماتا ہے اور جو تکبر اختیار کرے خدا اسے پست کر دیتا ہے جو شخص اپنی زندگی میں میانہ روی اور کفایت شعاری اپنائے خدا اسے رزق عطا فرماتا ہے اور جو فضول خرچی کرے خدا اسے محروم کر دیتا ہے۔

ومن اکثر ذکر الموت احبہ اللہ

جو زیادہ سے زیادہ موت کو یاد کرے خدا اسے دوست رکھتا ہے۔[1]

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حلال لذاتِ نفسانی سے چشم پوشی اور احتراز ایک قسم کا تواضع اور خشوع ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (۴-۶۲)

صیحہ محمد بن مسلم میں امام محمد باقر علیہ السلام 'آیہ' فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ۔ (۷۶-۲۳) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

الاستکانۃ ھو الخضوع والتضرع ھو رفع الیدین

---

[1] ص ۱۸۵ ج ۳، اصول کافی۔

والتضرع بهما۔[1]

یعنی،

استکانت سے مراد خضوع ہے اور تضرع سے مراد دونوں ہاتھ بلند کر کے گریہ و زاری کرنا ہے۔

دعا سے متعلق ایک بحث اسی کتاب کے آخر میں آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ

۱۱۔ حیاء

فی الصحیح عن الصادق علیہ السلام عن آبائہ عن رسول اللہؐ استحیوا من اللہ حق الحیاء قالوا و ما نفعل یا رسول اللہ قالؐ ان کنتم فاعلین فلا یبیتن احدکم الا واجلہ بین عینیہ ولیحفظ الرأس وافکارہ وما حوی والبطن وما وعی ولیذکر القبر والبلی وارد الآخرۃ فلیدع زینۃ الحیاۃ الدنیا[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: خدا سے صحیح معنوں میں شرم و حیا کرو، راوی نے پوچھا: یا رسول اللہ وہ کس طرح؟ آپؐ نے فرمایا اگر تمہیں عمل کرنا ہے تو اس طرح کہ تم میں سے ہر کوئی سوتے وقت موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھے! سر اور اس کے افکار کی حفاظت کرے۔ (افکار و خیالات کو پاک رکھے) پیٹ اور ماکولات (کھانے پینے کی اشیاء)

---

[1] ص ۲۳۰، ج ۴ اصول کافی۔

[2] ص ۳۳۳، ج ۱۷ بحار الانوار۔

کا خیال رکھے (پاک اور حلال اشیاء کھائے) قبر اور اس کی بوسیدگیاں یاد رکھے جو شخص آخرت چاہتا ہے وہ دنیا اور اس کی زینتیں ترک کر دے۔"

ظاہراً حیا سے مراد یہ ہے کہ انسان محرمات سے پرہیز کرے، واجبات بجا لائے غرض کہ خالق متعال کی مخالفت نہ کرے۔

ثمالی کی روایت حسنہ میں معصومؑ فرماتے ہیں:

جس انسان میں چار صفتیں موجود ہوں اس کا اسلام مکمل ہے اس کے ایمان کو تقویت ملتی ہے اس کے گناہ دھو دیئے جاتے ہیں:

۱۔ خدا سے جو وعدے کئے ہوں انہیں پورا کرے۔

۲۔ ہمیشہ سچ بولے۔

۳۔ ہر اس کام کی انجام دہی میں شرم و حیا محسوس کرے جو خدا اور اس کی مخلوق کی نظر میں قبیح ہو۔

۴۔ اہلِ خانہ اور دیگر متعلقین سے اچھے اخلاق سے پیش آئے۔[۱]

۱۲۔ خشیّت ــــ خوفِ خدا

خوفِ خدا کی اہمیت قرآن مجید کی متعدد آیات سے ظاہر ہوتی ہے بطور نمونہ صرف تین آیات کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے:

۱۔ "خدا اس بات کے لئے زیادہ سزاوار ہے کہ اس سے ڈرا جائے

۱۔ ص ۲۶۰، ج ۷۱، بحار الانوار۔

اگر تم مؤمن ہو"۔

۲۔"خداوندکریم سے صرف اہلِ ایمان ہی ڈرتے ہیں"۔

۳۔ لوگوں سے نہ ڈرو صرف مجھ سے ڈرو"۔

خوفِ خدا کا معنی

رسالہ اوصاف الاشراف میں محقق طوسی فرماتے ہیں :

"اگرچہ لغوی اعتبار سے خوف اور خشیت ہم معنی ہیں لیکن اہلِ دل (عارفین اور اولیاء) کی نظر میں ان دونوں (خوف و خشیت) میں فرق ہے کسی گناہ کے بُرے نتیجے کے خدشے میں نفس کی گھبراہٹ اور بے چینی کا نام خوف ہے جو معصیت کی وجہ سے اکثر افراد کو لاحق ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی عظمت اور اس کی ہیبت سے آگاہی کے بعد نفس کی حالت کو خشیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، نفس کی یہ کیفیت انہی لوگوں پر طاری ہوتی ہے جو جلال کبریائی سے آشنا اور قربِ خداوندی کی لذت سے بہرہ ور ہوں"۔

راغب کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خوف اور خشیت میں لغوی اعتبار سے بھی کچھ فرق پایا جاتا ہے، چنانچہ راغب نے کہا ہے :

"خشیت وہ خوف ہے جس کے ساتھ تعظیم اور احترام بھی ہو"۔

الخشیۃ خوف یشوبہ تعظیم و اکثر ما یکون ذالک عن علم بما یخشی منہ یعنی خشیت اس خوف کا نام جس کے ساتھ تعظیم بھی ہو اور اکثر اوقات یہ کیفیت وہاں حاصل ہوتی ہے جہاں ایسی چیز کا علم حاصل ہو جس سے خوف حاصل ہوتا ہو، بنا برایں خشیت کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ خشیت وہ خوف ہے جو

عظمت خداوندی سے حاصل ہو، واللہ العالم[1]

اگر یہ صحیح ہو تو خشیت اس خوف میں منحصر نہیں ہے جو گناہ سے حاصل ہو بلکہ یہ خوف معصومین اور اولیاء علیہم السلام میں بھی ہو سکتا ہو بلکہ جتنا جتنا کسی میں خدا کی عظمت زیادہ ہو گی، خشیت بھی زیادہ ہو گی۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے :

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا. (۳۵ : ۲۸)

"اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔"

بہرحال خشیت کی بنیادی وجہ وظائف الٰہی میں کوتاہی فرض کرنا ہو گی۔ ورنہ جہاں تک رحمت اور عدل الٰہی کا تعلق ہے اس میں خوف و ہراس کی کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اس موضوع پر مزید فکر کی ضرورت ہے۔

۱۳ تا ۱۶ خوف، امید، عدم یاس (مایوس نہ ہونا)

اور مکر الٰہی سے بے خطر نہ ہونا

خوف:

انسان کوتاہیوں اور گناہوں سے خالی نہیں ہے، گزشتہ بلکہ آئندہ گناہوں

---

[1] بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ خوف گناہگاروں کو خشیت دانشمندوں کو، وجل مجنونوں کو رہبت عابدوں کو اور ہیبت عارفوں کو ہوا کرتا ہے اس کی تفصیل خصال صدوق میں مذکور ہے جسے مجلسی نے بحار کے جلد ۷، ص ۳۸۰ میں نقل فرمایا ہے۔

کے عذاب کا خوف ہر وقت اسے دامن گیر رہنا چاہیئے۔

اگر انسان گزشتہ گناہوں سے توبہ کرے اور فرض کریں کہ توبہ کے بعد گناہ، خوف کا باعث نہیں بنتا پھر بھی تین مرحلے ایسے ہیں جن میں خوف کا ہونا لازمی ہے:

۱۔ یہ خوف کہ کہیں اس کی عبادت رد نہ کر دی جائے (یعنی قبول ہی نہ ہو)۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ ۙ (۲۳ : ۶۰)

اور جو لوگ (خدا کی راہ میں) جو کچھ بن پڑتا ہے دیتے ہیں اور پھر ان کے دل کو اس بات کا کھٹکا لگا ہوا ہے کہ انہیں اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جانا ہے (دیکھئے کیا ہوتا ہے)۔

۲۔ یہ خوف کہ اگر آئندہ معصیت کی تو خداوند اس پر دنیا یا آخرت میں عذاب نازل کرے گا۔

خوف کا موضوع (سبب) عذاب کا احتمال ہے اور یہ رحمتِ خداوندی کے منافی بھی نہیں ہے انسان کو ہمہ وقت یہ خوف رہنا چاہیئے کہ مبادا لذتِ گناہ اسے توبہ سے دُور رکھے اور ندامت ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ خدا توبہ سے پہلے اس پر عذاب نازل کر دے۔

۳۔ یہ خوف کہ کہیں اس کا نفسِ امارہ اسے اس اچھی حالت سے دُور کر دے جو اس نے حاصل کی ہے کہیں شیطان اسے اغوا نہ کرے۔

انسان چاہے جس مقام تک بھی پہنچا ہو دوبارہ گر سکتا ہے "وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا. قرآن مجید میں رسول اکرمؐ سے خطاب ہو رہا ہے۔

"اپنی اُمت کو اس شخص کا واقعہ سنا دو جسے ہم نے اپنی آیات اور نشانیاں دکھا دیں مگر وہ خود گمراہ ہوگیا، اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیات (معنوی نعمتوں) کے ذریعے بلند کرتے مگر وہ زمین (طبیعت) اور دنیا کی پستی پر فریفتہ ہوگیا اور اپنی ہوا و ہوس کا پیرو۔"

اس کی مثال اس کتے کی سی ہے کہ جس پر حملہ کریں یا نہ کریں ہر حالت میں زبان باہر نکالے گا، یہ بھی ان دوسرے لوگوں کی طرح ہے جنہوں نے ہماری آیات اور نشانیوں کی تکذیب کی۔

عبداللہ ابن سنان صحیح سند کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السّلام سے نقل کرتے ہیں کہ جناب ام سلمہ نے پیغمبر اکرمؐ کو نصف شب بستر میں نہ پایا۔ چنانچہ ان کی تلاش میں نکلیں، آنحضرتؐ ایک مقام پر قیام کی حالت میں نظر آئے آپؐ بلند آواز سے اس مناجات میں مشغول تھے۔

"اللّٰھم لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین ابداً ولا تنزع منی صالح ما اعطیتنی ابداً ولا تردنی الیٰ سوءٍ استنقذتنی منہ ابداً ولا تشمت بی عدواً ولا حاسداً ابداً۔" یعنی،

بار الٰہی مجھے مطلق العنان اور ہر لحاظ سے آسودہ حال نہ چھوڑ، بلکہ وقتاً فوقتاً بیماری یا اور کسی طریقے سے اپنی طرف متوجہ رکھ اور جس نیک عمل یا صحیح اعتقاد کی نعمت تو نے دی ہے اسے کبھی بھی مجھ سے سلب نہ کر اور مجھے اس بدی (برائی) کی طرف نہ پلٹا جس سے تو نے مجھے نجات دی ہے میرے دشمنوں اور حاسدوں کو خوشحال نہ کر۔

جناب ام سلمہ یہ جملے (خصوصاً جملہ اوّل) سن کر رونے لگیں، آنحضرتؐ

متوجہ ہوئے اور پوچھا کیوں رو رہی ہو؟ انہوں نے فرمایا آپ کی یہ حالت دیکھ کر رو رہی ہوں! آنحضرتؐ نے فرمایا: کیوں نہ روؤں؟ خدا نے میرے بھائی حضرت یونسؑ کو لمحہ بھر کے لئے اس کے سپرد کر دیا (اسے آزاد چھوڑا) جس کے نتیجے میں انہوں نے وہ کام انجام دیا جس کی وجہ سے انہیں شکم ماہی میں جانا پڑا۔

قارئین محترم! خدارا اس حدیث شریف اور آیۂ کریمہ کا مضمون ایک مرتبہ پھر پڑھیں اور غور فرمائیں کہ ہمارا یہ سفر کتنا وحشتناک اور ڈراؤنا ہے، اگرچہ آیۂ کریمہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ یہ کہتی ہے کہ مؤمنین کو کسی قسم کا خوف اور غم لاحق نہیں ہوتا لیکن ہو سکتا ہے اس آیۂ کریمہ میں خوفِ معصیت کی نفی کی گئی ہو کیونکہ گزشتہ آیات میں معصیت کا ذکر نہیں ہے اور اطاعت کے ساتھ خوف کا ذکر کیا گیا ہے۔

بنا براین اگر معصیت کا خوف نہ بھی ہو پھر بھی اعمال صالحہ کے مسترد ہونے یا آئندہ کے انحراف و معصیت کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں روز محشر کے خوف کی نفی کی گئی ہو۔ واللہ اعلم۔

خوف کے بارے میں آخری اور معتبر روایت

قیامت کے دن سوائے ان تین آنکھوں کے باقی سب رو رہی ہوں گی۔

۱۔ وہ آنکھ جس نے محرمات کو نہ دیکھا ہو۔

۲۔ جو اطاعت خدا میں رات بھر بیدار اور کھلی رہی ہو۔

۳۔ جو نصف شب خوفِ خدا سے روتی رہی ہو۔[1]

نیز روایتِ حسنہ میں معصومؑ فرماتے ہیں :

"اگر تمہیں رونا نہ آئے تو رونے کی شکل بنا لو۔"

امید و عدمِ یاس

گناہوں کا خوف ایسا بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ انسان رحمتِ خدا سے مایوسی اور نا امیدی کی حد تک پہنچ جائے، جیسے گناہانِ کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ بلکہ عبدالعظیم کی صحیح اور مشہور حدیث سے تو یہ استفادہ ہوتا ہے کہ رحمتِ الٰہی سے مایوسی (جس کی قرآن مجید میں شدید مذمت کی گئی ہے) شرک کے بعد سب گناہانِ کبیرہ سے بڑا گناہ ہے۔[2]

رحمتِ خدا سے مایوسی اس صورت میں بھی صحیح نہیں ہے۔ جب انسان حقوق الناس کی ادائیگی سے عاجز ہو کیونکہ خداوند کریم نے اس سے چھٹکارا اور گلو خلاصی کا طریقہ بھی بتا دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظالم مظلوم کے لئے استغفار کرے اور ممکن ہے خداوند فریق (مظلوم) کو روزِ قیامت راضی کر دے۔

باقی رہے حقوق اللہ تو ان کے لئے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے اور اس سے مایوسی کی وجہ صرف کفر اور گمراہی ہی ہو سکتی ہے۔

ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا (۵۲-۲۹)

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۴۲۳۔

[2] اصول کافی، ج ۳، ص ۳۹۰۔

مسقطات عقاب (عذاب الٰہی روکنے اور دور کرنے والے اعمال) کا تفصیلی ذکر "حدود الشریعہ فی واجباتہا" کے جزء چہارم میں کر چکا ہوں[1]، ان میں سے چند چیزیں یہ ہیں: توبہ، شفاعت، عفو (درگزر)، مصائب جو دنیا میں انسان کو پیش آتے ہیں، بعض واجب اور مستحب عبادات، حسن خلق اور استغفار وغیرہ۔

بہر حال رحمتِ الٰہی سے مایوسی، قرآن و حدیث کی رُو سے نیز نفسیاتی، اخلاقی اور اجتماعی اعتبار سے قابل مذمت اور قبیح ہے۔ حتیٰ المقدور اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔

مکرِ الٰہی سے بے خطر نہ ہونا

پوشیدہ نہ رہے کہ جس طرح رحمتِ خدا سے مایوسی گناہانِ کبیرہ میں شمار کی گئی ہے اسی طرح اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے بے خوف اور محفوظ و مامون سمجھنا بھی گناہانِ کبیرہ میں سے ہے۔

فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ. (۷-۹۹)

"مکرِ الٰہی سے وہی لوگ امن میں رہتے ہیں جو خسارے میں ہوں"

اور لطف خدا سے بھی انسان کو مغرور نہیں ہونا چاہیئے:

يَا اَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ. (۸۲-۶)

"اے انسان تجھے اپنے کریم پروردگار کے بارے میں کس چیز نے دھوکہ دیا؟"

---

[1] تحقیق کے لئے حدود الشریعہ ج ۱، مادہ توبہ، ج ۴، مادہ استغفار۔

جب رحمت خدا سے مایوسی اور عذاب الٰہی سے مامون رہنا دونوں حرام مؤکد اور گناہ کبیرہ ٹھہرے تو نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کو خوف اور امید دونوں رکھنے چاہئیں۔ نفس انسانی میں ایسی کیفیت اور حالت پیدا ہونی چاہیئے جس سے انسان خدا سے ڈرے بھی اور نجات و ہدایت اور بھلائی کی امید بھی رکھے

اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (۵-۹۸)

خدا کا عقاب بھی شدید اور سخت ہے اور وہ مہربان اور بخشنے والا بھی ہے۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ۔ (۹۹: ۷-۸)

تو جس نے ذرہ برابر نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہے تو اسے دیکھ لے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ (۳۹: ۵۳)

بیشک خدا (تمہارے) کل گناہوں کو بخش دے گا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ۔ (۸-۲)

سچے ایماندار تو بس وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) خدا کا ذکر کیا جاتا تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔

مؤمن صرف وہی لوگ ہیں جن کے دل ذکر خدا سے ڈر جاتے ہیں۔

جب ان کے سامنے ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنے پالنے والے پر توکل کرتے ہیں۔

۱۷۔ حسن ظن

اَلظَّآنِّیْنَ بِاللّٰہِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَیْھِمْ دَآئِرَۃُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰہُ

عَلَيْهِمْ۔ (۴۸ : ۶)

جو خدا کے حق میں بُرے خیال رکھتے ہیں ان پر (مصیبت کی) بڑی گردش ہے اور خدا ان پر غضبناک ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے منبر پر فرمایا:

"خدائے واحد کی قسم! مؤمن کو خدا کے بارے میں حسنِ ظن، اس کے رحم وکرم کی امید، حسن خلق اور مؤمن کی غیبت (بدگوئی) سے احتراز ہی سے دنیا و آخرت میسر ہو سکتی ہے۔

خدائے واحد کی قسم! خدا مؤمن کو توبہ اور استغفار کے بعد عذاب نہیں دیتا مگر یہ کہ وہ خدا کے بارے میں بدظن اور بدگمان ہو اور رحمت خدا کی امید میں کوتاہی کرے، بداخلاق ہو اور مؤمن کی غیبت کرے۔

اس خدا کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں! جو مؤمن بھی خدا کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہو خداوند اس حسنِ ظن کے پاس (حاضر) ہوتا ہے کیونکہ خدا کی ذات کریم ہے ہر خیر اس کے دستِ قدرت میں ہے، خدا کی ذات اس بات سے حیا کرتی ہے کہ اس کے بندے خدا کے بارے حسنِ ظن رکھیں اور وہ انکے حسنِ ظن اور امید کو خاک میں ملادے (درہم برہم کردے) اور اس کی امیدوں پہ پانی پھیردے، خدا کے بارے حسنِ ظن اور اسکی طرف رغبت رکھو۔"

ۡ بحار الانوار عن الکافی، ص ۳۶۶، ج ۷۰۔ بحار نے ایک اور صحیح السند روایت تفسیر قمی سے نقل کی ہے، ص ۳۸۴، ج ۷۰۔

روایت صحیحہ میں امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں :

احسن الظن باللہ فان اللہ عزّ وجل یقول انا عند حسن ظن عبدی المؤمن ان خیرا فخیر وان شرا فشر.[1]

خدا کے بارے میں حسن ظن رکھو کیونکہ خدا فرماتا ہے میں اپنے بندۂ مؤمن کے حسنِ ظن کے پاس ہوتا ہوں۔ اگر اس کا ظن اچھا ہو تو اس تک خیر پہنچاتا ہوں اور بدگمان ہو تو شر۔

خلاصہ یہ کہ خدا کے بارے میں بدگمانی محرماتِ شرعی میں سے ہے اور حسنِ ظن پُر برکت کمالات میں سے ہے ۔

۱۸۔ وفائے عہد

اَوْفُوْا بِعَھْدِیْ. (۲۔۴۰)

میرے وعدے کی وفا کرو ۔

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللہَ عَلَیْہِ فَمِنْھُمْ مَنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَ مِنْھُمْ مَنْ یَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلاً. (۳۳۔۲۳)

بعض مؤمن (سب نہیں) ایسے ہیں جنہوں نے خدا کے ساتھ کئے ہوئے وعدے صداقت کے ساتھ پورے کئے ہیں، ان میں سے بعض تو گزر گئے ہیں اور بعض منتظر ہیں اور انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔

---

[1] بحار، ۳۶۶، ج ۷۰ ۔

اگر ہم واجبات بجا لائیں، محرمات ترک کریں اور اخلاقی مقدسات کی رعایت کریں تو یقیناً ہم نے خدا سے کئے ہوئے وعدے پورے کر دیئے ہیں۔

۱۹۔ ہر چیز میں خود کو خدا کا محتاج سمجھنا

یہ عالم ممکنات اپنی ابتدائی آفرینش اور ہر لحظہ اپنے وجود کے ہر لمحے میں بقا کے لئے واجب الوجود ذات کا محتاج ہے!

گر فیض تو یک لحظہ بعالم نرسد
معلوم شود بود و نبود ہمہ کس

"اگر تیرا فیض ایک لمحہ کے لئے بھی عالم تک نہ پہنچے تو ہر شخص کو اپنے وجود و عدم کا پتہ چل جائے"۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

"لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور صرف خدا کی ذات بے نیاز و مستغنی ہے"۔ مسلمان کو چاہیئے کہ وہ صرف خدا سے مدد طلب کرے "(اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ)۔ "اور تجھ ہی سے ہم مدد طلب کرتے ہیں"؛ اور باقی موجودات کو صرف وسیلہ اور آلہ کار سمجھے۔

درگاہِ الٰہی میں، دعا کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور قرآن و سنّت میں دعا کو خاص توجہ کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ دعا کے موضوع پر تفصیلی گفتگو اس کتاب کی گنجائش سے باہر ہے۔ تاہم اس کتاب کے آخر میں دعا سے متعلق ایک مختصر سی بحث ضرور کی جائے گی، دعا کی تاکید پر جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ خدا

کا محتاج ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان، بلکہ پوری کائنات، چھوٹے سے کرۂ ارض پر جہاں مختلف تقاضوں اور اسباب وعلل کا باہمی ٹکراؤ ہے، کسی آرزو اور مقصد تک پہنچنا تو بجائے خود اپنے وجود، صفات اور افعال میں بھی لمحہ بہ لمحہ فیضِ الٰہی کا محتاج ہے۔

وہ تمام اسباب وعلل جو زندگی کو باقی رکھنے، ہر قسم کی فعالیت (کارکردگی) احتیاجات کو پورا کرنے اور آرزوؤں تک پہنچنے میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں یقیناً ان کی تکوینی اور طبیعی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کے حصول کی کوشش کی جانی چاہیئے۔

لیکن ساتھ ساتھ دو نکتوں کی طرف توجہ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ تمام امور، اسباب وعلل، ارادۂ الٰہی کے آگے بے بس ہیں (وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے) دوسرا یہ کہ کوئی بھی علت اور سبب، محدود اور خاص حالت میں قابل استفادہ ہوا کرتا ہے اور حالات کی معمولی تبدیلی سے علل واسباب بے اثر ہو جاتے ہیں۔ تن سے سر جدا ہو جاتے ہیں، سروں سے تاج اُتر جاتے ہیں۔ خصوصاً آج کل کی دنیا جو اسباب کے باہمی ٹکراؤ کی دنیا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ اسباب ظاہری کی اہمیت اور ان کے اثرات پیش نظر رکھ کر اپنے آپ کو خدا کا محتاج سمجھے اور اس کے دربار میں دستِ سوال ہمیشہ دراز رکھے۔

۲۰۔ توبہ کرنا

منجملہ اخلاقی صفات اور واجبات فقہی وشرعی میں سے ایک یہ ہے

کہ انسان اپنے گزشتہ گناہوں اور معصیتوں پر نادم اور پشیمان ہو۔ اس سے انسان اور خدا میں رابطہ اور تعلق مضبوط ہو جاتا ہے۔

تُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (۲۴-۳۱)

اے صاحبان ایمان توبہ کرو (خدا کی طرف پلٹ آؤ) شاید فلاح پاؤ (اسی میں تمہاری کامیابی ہے)۔

توبہ کی بحث میں بہت سے مسائل زیر بحث آسکتے ہیں، جن کا تفصیلی ذکر بحمد اللہ "حدود الشریعہ فی واجباتہا" کی ج ۳، ص ۱۰۸ تا ۱۳۱ پر کر چکا ہوں۔ اہل تحقیق اس کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

قضا عبادات بجا لانا، مستحقین کو ان کے حقوق و اموال واپس کرنا، اور لوگوں کی حیثیت اور عزت کو بحال کرنا جنہیں مورد تہمت و الزام ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ سب ایک قسم کی توبہ ہے، توبہ ایسا فرض ہے جسے فوراً انجام دینا چاہیے۔

توبہ کے اہم فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے گناہ گاروں کی برائیاں نیکیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا۔ (۲۵-۷۰)

جو آدمی توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دے خدا اس کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے، خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اس موضوع پر چار معتبر روایات موجود ہیں:

۱۔ بندے کی توبہ سے خدا کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی کسی

شخص کو زادِ راہ اور سواری کو کھو دینے کے بعد دوبارہ اس کی دستیابی سے ہوتی ہے۔"

ظاہراً خدا کی خوشی سے مراد اس کا ثواب عطا کرنا ہے۔

۲۔"جس مؤمن سے بھی کوئی گناہ سرزد ہو خدا اسے سات دن کی مہلت دیتا ہے اگر اس دوران توبہ کرے تو یہ گناہ اس کے نامۂ اعمال میں نہیں لکھا جاتا اور اگر توبہ نہ کرے تو ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے۔"

۳۔جب خداوند تعالیٰ نے ابلیس کو لوگوں کو ورغلانے کی قدرت دی اس وقت حضرت آدمؑ نے عرض کیا: پالنے والے تو نے ابلیس کو میری اولاد پر مسلط کر دیا۔ "و اجریتہ منھم مجری الدم فی العروق" لوگوں میں اس طرح آزاد گھل مل کر رہنے کی قدرت دی ہے جس طرح رگوں میں خون جاری ہوتا ہے۔ مجھے اور میری اولاد کو تو نے کونسی نعمت دی ہے؟ خالق نے فرمایا: نہیں اور تمہاری اولاد کو یہ نعمت دی ہے کہ ایک برائی (معصیت) کی ایک ہی سزا دوں گا، لیکن ایک کارِ خیر کا دس گناہ ثواب دوں گا۔ حضرت آدمؑ نے عرض کی: خالق، اس پر اضافہ فرما، خالق نے فرمایا تمہارے اور تمہاری اولاد کے لئے توبہ کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا پالنے والے اس پر بھی اضافہ فرما، ارشاد ہوا یہ آدم کے گناہوں کو بخش دوں گا اور اس میں کسی کی پرواہ نہیں کروں گا۔ حضرت آدمؑ نے عرض کی اتنی نعمتیں اور رحمتیں کافی ہیں۔"

۴۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم کرے اور اسے (مظلوم) راضی کرنا ممکن نہ ہو تو اس (مظلوم)

کے لئے استغفار کرے اور یہی اس کے ظلم کا کفارہ ہے[1]

خلاصہ

اس حصے میں اسلامی اخلاق سے متعلق ۲۰ ایسی صفات بیان کی گئیں جن سے خدا کے روبرو انسان کو متصف ہونا چاہیئے وہ بیس صفات یہ تھیں :

۱۔ خدا سے محبت	۲۔ خدا کی یاد
۳۔ اخلاص	۴۔ یقین
۵۔ توکل	۶۔ تفویض
۷۔ رضا	۸۔ تسلیم
۹۔ شکر گزاری	۱۰۔ خشوع و تواضع
۱۱۔ حیاء	۱۲۔ خشیت
۱۳۔ خوف	۱۴۔ امید
۱۵۔ عدم یاس (مایوس نہ ہونا)	۱۶۔ مکر الٰہی سے عدم تحفظ
۱۷۔ حسن ظن	۱۸۔ وفائے عہد
۱۹۔ اپنے آپ کو محتاج سمجھنا	۲۰۔ توبہ

ان صفات کے حصول کو آسان اور مشکل ہونے کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلی قسم ان صفات کی ہے جنہیں حاصل کرنا آسان ہے اور ان کے

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۳۴۳۔

حصول کی طرف نفس کی توجہ ہی کافی ہے۔ صرف یہ ضروری ہے کہ اس راہ پر چلنے والا غفلت نہ کرے۔

پہلی قسم کی صفات یہ ہیں:

خوف، اُمّید، عدم یاس، مکرِ الٰہی سے بے خطر نہ ہونا، خدا کی یاد، شکرگزاری، اپنے آپ کو محتاجِ خدا سمجھنا۔

دوسری قسم ان صفات کی ہے جن کا حصول کسی حد تک مشکل ہے اور اس کے اسباب فراہم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری قسم کی صفات یہ ہیں:

خدا سے محبت، یقین، تسلیم، رضا، وفائے عہد۔

خدا سے محبت، ان دونوں سببوں[1] کی روشنی میں ان کی طرف دائمی توجہ سے حاصل ہوتی ہے۔

محبت کے اگرچہ کئی درجے ہیں لیکن محبت کے اعلیٰ درجے کے حصول میں علم الابدان، وسعتِ فضا، زمین اور آسمانی کرات کے استحکام کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

استدلال، مختلف دلائل کے مطالعہ اور عباداتِ الٰہی سے یقین حاصل ہوتا ہے، خدا سے راضی رہنے کے سلسلے میں کافی حد تک عقل سے استفادہ

---

[1] ۱۔ خدا کمالِ مطلق بلکہ ہر کمال کا سرچشمہ ہے اور انسان کو کمال دوست ہونا چاہیئے۔

۲۔ وہ منعم ہے اور منعم سے محبت کرنی چاہیئے۔

کرنا چاہیئے تاکہ عقل کی روشنی میں فقیری، بیماری، محرومیت، ناداری اور دیگر مشکلات و بدبختیوں کے علل و اسباب کی تحلیل کی جا سکے اس بات پر ناراض نہیں ہونا چاہیئے کہ ہر کام اور حالت کا تعلق قضائے الٰہی سے ہے ان مسائل کو سمجھنے کے لئے صحیح و صاف ذہن اور حسن سلیقہ کے علاوہ زیادہ سے زیادہ مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت ہے جو اکثر طالبعلموں کو حاصل نہیں ہوتی۔

وفائے عہد عام معنوں میں عدالت کا نام ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان واجبات بجا لائے اور محرمات ترک کر دے۔ اس کے لئے ایک مضبوط، مردانہ ارادے کی ضرورت ہے اس ارادہ کا سبب عذاب الٰہی کا خوف، ثواب کا لالچ یا خدا سے دوستی ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔

(۳۴ : ۱۳)

میرے بندوں میں بہت کم بندے شکر گزار ہیں۔

تیسری قسم ، باقی صفات پر مشتمل ہے۔ بہر حال ان کے حصول کے لئے سب سے پہلے تو تکرار کے ذریعے انہیں حفظ کر لینا چاہیئے اور غفلت نہ برتی جائے تاکہ وہ فراموش نہ ہو جائیں۔

اس کے بعد دوسرے مرحلے میں ان صفات کے اسباب کی طرف توجہ دینا چاہیئے جن کا حصول نہ تو اتنا مشکل ہے اور نہ اس کے لئے مدتِ دراز درکار ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

جو لوگ ہماری راہ میں جہاد اور کوشش کرتے ہیں ہم ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (۲۹-۶۹)

"یقیناً خدا احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

اسلام نے انسانوں کے تکامل اور ان کو حدِ کمال تک پہنچانے میں آئیڈیلزم اور محض تخیلات سے کام نہیں لیا اور نہ ہی اپنے پیروکاروں کو تاحیات تنگی و مشکلات میں مبتلا کیا ہے بلکہ اسلام ایک سہل، آسان اور فطری دین ہے۔

دوسرا حصہ

انسان کا انفرادی اخلاق

- تفکر - درجات فکر کا ایک درجہ مراقبہ و محاسبہ نفس ہے - غور طلب نکتہ - زندگی کے بارے میں حسن ظن - تحصیل علم - زہد - پرہیزگاری - دوسرا مطلب - تیسرا مطلب - چوتھا مطلب - زہد کے بارے میں - زہد کی دوسری قسم - زہد کی تیسری قسم - زہد معتبر روایات کی روشنی میں - جاہ و مقام و شہرت سے محبت نہ ہونا - بغض معصیت - حق کی حمایت - قناعت - بلند ہمتی - صبر و تحمل - صبر کا معنی - گناہوں کے زوال میں بیماری کا اثر - عفت و پاکدامنی - برائی سے زبان بچانا - عجب و خود پسندی - اس بحث کے آخر پر دو احادیث - تزکیۂ نفس - شجاعت - خوف کی قسمیں - وقار - حلم و بردباری - غرور نہ کرنا - سخاوت - ایثار - اختتامیہ (ہدف اور وسیلہ) ۔

انسان اگرچہ اکیلا اور تنہائی کی زندگی نہ گزار رہا ہو ، شریعت اسلام کی رو سے اسے چاہیئے کہ ان صفات اور اخلاق سے آراستہ ہو۔[1]

۱۔ تفکّر

جس طرح انجن اسٹارٹ ہوئے بغیر حرکت نہیں کرسکتا اسی طرح ایک انسان بھی اس وقت تکامل اور حدِ کمال تک نہیں پہنچ سکتا ، جب تک اس کی فکر حرکت میں نہ آجائے۔ گویا فکر انسانیت کی سواری اور ذریعہ ہے اور انسانی شخصیّت کا مقدر فکر کے ہاتھ میں ہے۔

---

[1] قرآن فرماتا ہے : لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ "تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے ، یہ حقیقت ہے کہ انسان کو پہلے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیئے اس کے بعد وہ دوسروں کو درس دے اور کتابیں لکھے ، بدقسمتی سے راقم الحروف بعض ایسی اچھی اور اخلاقی صفات سے محروم ہے جن کا کتاب کے ان دونوں حصوں میں ذکر کیا جارہا ہے لہذا قارئینِ محترم کے سامنے اس حقیقت کا اظہار واعتراف ضروری ←

فکر کا مقام اتنا بلند ہے کہ دقیق النظر، باریک بین، دانشمندوں نے فکر کو ذات انسان کا جزء قرار دیا ہے (جس طرح کسی چیز کے خاص لازم کو اس چیز (ملزوم) کی جگہ استعمال کریں یعنی تفکّر حقیقت میں انسان کا جزء فعل تو نہیں البتہ اس جزء کے لوازمات میں سے ایک اہم اور خاص جزء ضرور ہے) انسانی صفات میں سے کسی کو بھی فکر کی مانند انسان کی تعریف میں ذکر نہیں کیا گیا اور صرف فکر کو حیوان ناطق (متفکر) کی صورت میں حقیقت انسان کے طور پہ ظاہر کیا گیا ہے۔

تدبّر و تعقل اور فکر و نظر کے بارے میں قرآن مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں اور فکر کی اہمیت پر بار بار روشنی ڈالی گئی ہے اور یہاں تک فرمایا گیا ہے:

"آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان موجود چیزوں کے بارے میں

← ہے کہ وہ صفات حسنہ کہ جن سے راقم متصف نہیں ہے انہیں بیان کرنے کا مقصد اپنے سرکش نفس کے لئے تنبیہ اور یاد دہانی ہے نہ کہ قارئین محترم کے لئے کوئی وعظ و نصیحت ہے، تاکہ مذکورہ آیۂ کریمہ "لم تقولون ما لا تفعلون" کی مخالفت لازم نہ آئے۔ استغفر اللّٰہ الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ توبۃ عبد ذلیل خاشع مسکین مستکین لا یستطیع لنفسہ نفعاً ولا ضراً ولا حیٰوۃ ولا موتاً ولا نشوراً واستشفع بمحمد وآلہ الطاہرین صلوات اللّٰہ علیہم اجمعین۔

میرا عقیدہ ہے کہ مؤلف جلیل القدر جنہیں ہم نے نزدیک سے دیکھا ہے ان تمام صفات حسنہ سے آراستہ ہیں جن سے ایک فقیہ کو متصف ہونا چاہیئے اس بناء پر مذکورہ جملوں کو ان کی تواضع اور کسر نفسی سمجھتا ہوں۔ (مترجم)

غور و فکر کرو کہ ان کی خلقت برحق ہے :"

حسن بن الجہم نے امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا :

"مجھے کچھ لوگ ایسے نظر آتے ہیں جن کے دلوں میں آپ کی محبت تو ہے مگر کوئی پختہ اور صحیح عزم نہیں رکھتے ۔ جبکہ آپ کی ولایت و امامت کو بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ امامؑ نے فرمایا : یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے سرزنش کی ہے خدا نے صرف صاحبان بصیرت اور اہلِ فکر سے فرمایا ہے کہ عبرت حاصل کریں۔"[1]

درجاتِ فکر کا ایک درجہ مراقبہ و محاسبہ نفس ہے

محاسبہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان روزمرہ کے اعمال و کردار میں نفس سے حساب لے بلکہ بہتر یہ ہے کہ انسان اس کام کے لئے کوئی خاص وقت معین کرے ۔ اگر اچھا اور نیک کام انجام دیا ہو تو خدا کا شکر کرے اور خدا سے مزید اعمال کی توفیق طلب کرے اور اگر کوئی برا کام انجام دیا ہو تو اس سے مغفرت طلب کرے ۔ اگر وہ کام قابلِ تلافی ہو تو اس کی تلافی کرے (حقوق الناس میں سے ہے تو اسے ادا کرے) ۔ اپنے نفس کو سرزنش کرے اور آئندہ اسے ترک کرنے کا مصمم ارادہ کرے ۔ اس سے اہم بات یہ ہے کہ انسان سوچے کہ اپنی عمر کی اس قلیل مدت میں وہ کونسا عمل انجام دے جو اس کے مفاد میں ہے اور کس طرح خدا و مخلوقِ خدا اور اس کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں ۔ بسا اوقات ایک لمحہ کی فکر ہمیشہ کی برکات اور سعادت کا باعث

---

[1] اصول کافی کے آغاز میں ۔

بن جاتی ہے۔

مراقبہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے ظاہر و باطن پر کڑی نظر رکھے کہ کہیں وہ راہِ راست سے منحرف تو نہیں ہو رہا اور یہ یقین رکھے کہ وہ براہِ راست خدا کے زیرِ نظر ہے:

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا۔ (۴ : ۱)

امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام صحیحہ ابراہیم میں فرماتے ہیں:

لیس منا من لم یحاسب نفسه فی کل یوم فان عمل حسنا استزاد الله و ان عمل سیئا استغفر الله منه و تاب الیه[1]

یعنی "جو شخص روزانہ اپنا محاسبہ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ضرور محاسبہ کرو، اگر اچھا عمل انجام دیا ہو تو خدا سے مزید عملِ خیر کی توفیق طلب کرو اور اگر بُرا عمل انجام دیا ہو تو خدا سے مغفرت اور توبہ کرو۔"

بہرحال اگر علم کو سرمایہ اور دولت فرض کیا جائے تو فکر اس میں تجارت اور معاملہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرمایہ کا جب تک معاملہ نہ کیا جائے اور اس میں تجارت نہ کی جائے تو اس سرمایہ کے نابود اور ختم ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ کوئی بھی عاقل فکر و نظر کے ذریعے مجہولات کا علم حاصل کر کے معلومات کے خزانے میں اضافہ کر سکتا ہے۔[2]

---

[1] الوسایل ج ۱۱، ص ۳۷۷۔

[2] فکر کی تعریف منطق مظفر جیسی کتب علم منطق میں مل سکتی ہے علم اخلاق میں اس سے بحث نہیں کی جاتی۔

اس آیۂ کریمہ میں غور فرمائیں کہ فکر نہ کرنے کا انجام کتنا بُرا ہوتا ہے ؟
"وَيَجْعَلُ اللهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ" (۱۰ : ۱۰۰)
اور جو لوگ (اصول دین میں) عقل سے کام نہیں لیتے انہیں لوگوں پر خدا (کفر کی) گندگی ڈالتا ہے

غور طلب نکتہ

مقامِ حیرت ہے کہ شریعت مقدس اسلام نے وہ تمام اعمال و وسائل حرام قرار دیئے ہیں جو فکر و نظر کے لئے مانع ہوں۔ مثال کے طور پر شراب یا دوسری منشیات جو عقل سے کام لینے میں رکاوٹ ہیں، ان کا مقابلہ اسلام نے سختی سے کیا ہے اور اس کی مذمت میں عجیب مضامین کی آیات روایات موجود ہیں، شراب خوری تو درکنار اس کی خرید و فروخت، نقل و حرکت اور اس کی تیاری اس دسترخوان پر بیٹھنا جس پر شراب پی جاتی ہو بلکہ اس سے دور بیٹھ کر بھی اس دسترخوان سے حلال لقمہ اٹھانے کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔
اور نہ صرف اسلام بلکہ تمام شریعتوں اور آسمانی ادیان میں شراب خوری کو حرام قرار دیا گیا ہے[1]، آج کل کے دور میں لہو و لعب میں مصروف رہنا انسانی فکر کے لئے ایک بڑی رکاوٹ ہے اور اسلامی فقہ میں اس کو حرام قرار دیا گیا ہے
(حدود الشریعۃ فی محرماتہا)

---

[1] وسائل، ج ۱۷، ص ۲۳۷۔

۲۔ زندگی کے بارے میں حسنِ ظن

ہر مسلمان مؤمن کا کوئی نہ کوئی ہدف ہونا چاہیئے، جس کے سامنے کوئی ہدف نہیں وہ مؤمن نہیں کہلا سکتا۔ یہ ایسا موضوع نہیں جس پر ہم یہاں بحث کریں اس مقام پر یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ مؤمن کو ہرگز اپنی زندگی کے بارے میں بدبین و بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ اسے چاہیئے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی اصلاح اور حق و حقیقت کی خدمت سے مایوس نہ ہو۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں انسان سست اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کو اپنے بارے میں زیادہ خوش بینی اور خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے لیکن بددلی، خوش بینی اور خوش فہمی سے بھی بدتر ہے اسی طرح ناامیدی، لمبی آرزوؤں سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے لہذا ہمیں یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ ہم اپنے علم و فہم کے مطابق موجودہ حالات میں زبان، قلم اور قدم کے ذریعے دوسروں کی خدمت کر سکتے ہیں اسی طرح تحصیل علم و کمال، اگرچہ اپنے لئے ہی سہی، مفید ہے اور اس کی مدد سے کسی مقام تک پہنچ سکتا ہے۔

کسی خاص مقام تک پہنچنے والے کامل انسانوں کے نہ تو کوئی خاص حالات تھے اور نہ ہی وہ غیر معمولی کرامات کے حامل تھے (بلکہ سب کچھ ان کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے):

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳ : ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹ : ۶۹)

"اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا انہیں ہم ضرور اپنی راہ کی ہدایت کریں گے۔"

مایوسی اور بددلی انسان کے عزم و ارادہ کو مفلوج کر دیتی ہے اور اسے دینی اور دنیوی مقاصد سے دُور رکھتی ہے۔ اپنے نفس پر اعتماد، کائنات اور اس کے حوادث و واقعات کے سلسلے میں انسان کی خوش بینی کا باعث بنتا ہے۔ خصوصاً وہ مؤمنین جو حکمتِ الٰہی کے معتقد ہیں۔ اور جہان اور اس کے واقعات کو انتہائی کمال اور استحکام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔[1]

خوش بینی کے آثار میں سے ایک یہ ہے کہ یہ انسان کو محنتی اور جفاکش بنا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ زحمت اور محنت بہت سی برکات کا سرچشمہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سستی اور بے کاری کا اہم سبب اعتماد بہ نفس کی کمزوری، پیشرفت اور ہدف تک رسائی کا اعتقاد نہ ہونا ہے۔ جب مایوسی اور بدبینی انسان پر چھا جائے تو یہ انسان کی فعالیت، حرکت اور کارکردگی کو سست کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں اس کی عمر ضائع ہو جاتی ہے۔

۳۔ تحصیل علم

جہالت اور نادانی انسانیت کے لئے ایک بہت بڑی بلا ہے اکثر اخلاقی نفسیاتی، اجتماعی اور انفرادی تباہیوں، بدبختیوں کا سرچشمہ جہالت ہے۔ شاید کسی بھی دین، قانون اور مذہب نے علم و علماء کو اہمیت دینے کی اور حصولِ علم کی اتنی تاکید نہیں کی جتنی دینِ اسلام نے کی ہے۔ بلکہ قرآن

---

[1] صراط الحق، میتافیزیک از نظر ریالزم اور دیگر کلام کی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

سنّت میں بھی علم و علماء کی تعریف و فضیلت اور جہالت کی مذمت بڑی حد تک موجود ہے۔ یہ مسئلہ اتنا واضح اور آشکار ہے کہ اس سلسلے میں نصوص دینی، آیات و روایات، کا ذکر بھی بے فائدہ نظر آتا ہے۔

ہم یہاں پر بطور تبرک صرف ایک روایت کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ مرحوم کلینی اصول کافی میں صحیح سند سے یہ روایت نقل کرتے ہیں:

عالم ینتفع بعلمہ خیر من سبعین الف عابد

وہ عالم جس کے علم سے استفادہ کیا جاتا ہے ستر ہزار عبادت گزاروں سے بہتر ہے۔

اس مقام پر چند باتیں راقم کے ذہن میں آتی ہیں، قارئین محترم ضرور ان کی طرف خصوصی توجہ دیں۔ واللہ الموفق۔

۱۔ تعلیم بالغاں کو بوڑھوں تک عام کر دیا جائے۔ مقام افسوس ہے کہ اسلام کی انتہائی تاکید اور تلقین کے باوجود دیگر اقوام کی نسبت مسلمانوں میں ان پڑھوں کی کثرت ہے اور اکثر مسلمان جہالت کے کینسر میں مبتلا ہیں۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے !!؟

۲۔ مذہبی، اخلاقی، فقہی، اعتقادی، علمی اور سیاسی کتابوں کا اس طرح پابندی سے مطالعہ کیا جائے جس طرح خوراک پابندی سے کھائی جاتی ہے۔

۳۔ یہ عادت بنائی جائے کہ ہر ہفتے میں ایک چھوٹی اور ہر مہینے میں ایک بڑی کتاب کا مکمّل مطالعہ کیا جائے۔

۴۔ کتب، اخبارات اور رسائل سے مفید مطالب تحریر میں لائے جائیں اور نوٹس لکھے جائیں۔

۵۔ اپنی قدرت اور استعداد کے مطابق علمی موضوعات پر تحقیق اور تحلیل و تجزیہ کے لئے چند اشخاص پر مشتمل انجمن تشکیل دی جائے۔

۶۔ وقت کے تقاضوں اور احتیاجات کے مطابق انفرادی یا اجتماعی صورت میں کتابچے لکھے جائیں اگرچہ یہ کتابچے مختلف اشخاص کے مختلف مقالوں پر مشتمل ہوں۔

۷۔ علمی سیمناروں اور اجتماعات کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔

۸۔ تقریروں اور مقالہ نویسی کی مشق کی جائے۔

۹۔ علماء کرام کا احترام کیا جائے، حصولِ علم کے سلسلے میں تواضع اور فروتنی اختیار کی جائے۔ تخصص اور مہارت کی حد تک علوم کا مطالعہ کیا جائے اور اس سلسلے میں سوال کرنے سے نہ شرمائیں

یہاں قارئین کی توجہ ایک اہم موضوع کی طرف مبذول کرانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے تنزل اور مسلمانوں کی اجتماعی، سیاسی، اقتصادی اور فوجی زندگی سے اس کے دُور ہونے کی واحد وجہ حکام اور اربابِ اقتدار کی اصول و فروعِ اسلام سے جہالت ہے۔ اگر خلفاء بنی امیہ اور خلفاء بنو عباس اور دیگر حکام، علماء باعمل اور راسخ العقیدہ ہوتے، اگر بادشاہ، خلفاء جمہوری حکومتوں کے صدر اور اسلامی ممالک کے حکام کا انتخاب متقی دانشمندوں میں سے کیا جاتا تو اسلام کا مقام کچھ اور ہوتا اور ۸۰ یا ۹۰٪ کرہ ارض اس کے زیر تسلط ہوتا۔ خدا جہالت، نادانی اور فسق پر لعنت کرے، اور واقعاً اس نے

لعنت کی ہے۔

۴۔ زہد = پرہیز گاری

زہد سے مراد دلی لگاؤ اور عملی استفادہ کے لحاظ سے دنیا کو ترک کرنا ہے لیکن اسلامی اصولوں کی روشنی میں حب دنیا (جسے اصول کافی کی بعض غیر معتبر روایات میں ہر برائی کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے) حصول دنیا اور اس سے استفادہ کی وضاحت کے لئے درج ذیل مطالب کی طرف توجہ فرمائیں کیونکہ یہ ایک اخلاقی موضوع ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی اور اقتصادی زندگی کی تقدیر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے:

حیاتِ[1] دنیا، یعنی موجودہ اور وقتی زندگی کی قرآن نے سخت اور تکرار کے ساتھ مذمت کی ہے انسان اس دنیا میں صرف جینے کے لیے مخلق نہیں کیا گیا، انسان کو کسی اور جہان میں جینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس دنیا میں انسان کا بنیادی فرض عبادت، تکامل اور حد کمال تک پہنچنا ہے۔

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱ : ۵۶)

---

[1] دنیا بروزن کبریٰ افعل التفضیل کی مؤنث اور حیات کی صفت ہے۔ دنیا بمعنی جہان نہیں ہے اور قرآن کی کسی بھی آیہ میں لفظ دنیا حیات کے لئے مضاف الیہ کے طور پر استعمال نہیں ہوا۔ بنا براین "الحیاۃ الدنیا" کا مطلب دنیا کی زندگی یا دنیا میں زندگی ہرگز نہیں بلکہ "الحیاۃ الدنیا" کا مطلب ہے بہت نزدیک زندگی۔ ایک احتمال کے مطابق بہت پست زندگی۔ کیونکہ یہ دونوں دنیا ہی کے معنی ہیں۔ البتہ نزدیک "دنو" کا معنی ہے اور پست "دنی" کا۔ دونوں کی افعل التفضیل مؤنث دنیا ہے۔ (غور کیجئے)

میں نے جن و انس کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (۱۱ : ۱۱۹)

مگر وہ لوگ جن پر خدا نے رحم فرمایا ہو اور اسی رحمت کی خاطر اس نے لوگوں کو خلق فرمایا ہے۔

زندگانی دنیا (کھانا، پینا، لذت حاصل کرنا وغیرہ) دوسری زندگی (ایک عالی زندگی جس سے تکامل نفس اور قرب الٰہی حاصل ہو) سے منافات رکھتی ہے۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ

تم میں سے بعض دنیا کو اور بعض آخرت کو چاہتے ہیں۔ (۳ : ۱۵۲)

بنابراین حیات دنیا سے محبت اور اسے اپنانا، مراسم عبادت کو ترک کرنے تکامل کی راہ سے خارج ہونے اور روبہ انحطاط و تنزل اور حق تعالیٰ سے دور ہونے کے مترادف ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ (۱۴ : ۳)

وہ کافر جو آخرت کی نسبت زندگانی دنیا سے زیادہ محبت رکھتے ہیں وہ کھلی گمراہی پر ہیں۔

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (۱۳-۲۶)

یہ لوگ پست یا نزدیک زندگی پر خوش ہیں جبکہ یہ زندگی دوسری زندگی (اعلیٰ زندگی) کے مقابلے میں ایک معمولی چیز ہے۔

دوسرے الفاظ میں اسی جہان میں اور مرنے سے قبل دو قسم کی زندگی

ہوا کرتی ہے۔[1]

۱۔ دنیا یعنی پست زندگی ۔

۲۔ پاک اور اعلیٰ زندگی ۔

پہلی قسم ہر اس فعالیت اور عمل کا نام ہے جو خدا اور جہان آخرت کے لئے انجام نہ پایا ہو۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ (۶:۳۲)

زندگانی دنیا لہو اور لعب کے علاوہ کچھ بھی نہیں ۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ (۵۷:۲۰)

"جان رکھو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل اور تماشا اور ظاہری زینت اور ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے"۔

حیات دنیا لہو و لعب، کھیل کود، آرائش ایک دوسرے پر فخر کرنے، مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی مال دنیا کے بارے میں خود ستائی، کثرتِ اولاد کی فکر اور ظاہری شان و شوکت کا نام ہے ۔

---

[1] یعنی حیاتِ دنیا سے مراد کبھی ولادت کے بعد اور موت سے پہلے کی وہ زندگی ہے جو برائیوں اور نیکیوں پر مشتمل ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے جیسے : اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ـــــ نیز ـــ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ـــــ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ۔

یہ وہ زندگی ہے جو قیامت کے بعد کی زندگی کے مقابلے میں ہے ۔

اور کبھی موجودہ اور پست زندگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو حیاتِ طیبہ کے مقابلے میں ہے یہ دونوں زندگیاں اسی دنیا میں ہوں گی ۔

زندگی کی دوسری قسم ان اعمال و افعال سے عبارت ہے جس میں لہو و لعب، کھیل کود اور دیگر مذکورہ چیزیں نہ ہوں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

(نحل : ۹۷)

ہر وہ شخص جو نیک اعمال بجالائے اور وہ مؤمن ہو ہم اسے ایک پاک اور پاکیزہ زندگی دیتے ہیں اور اسے اس کے عمل سے بہتر اجر دیتے ہیں۔

عبد بن یعفور نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: مولا! ہم دنیا سے محبت کرتے ہیں (مراد مال و ثروتِ دنیا ہے) آپؑ نے فرمایا: تم اسے کس کام لاتے ہو؟ یعفور نے فرمایا: ہم اس سے شادی کرتے ہیں، حج بجالاتے ہیں، محتاجوں کو کھانا کھلاتے ہیں، مؤمن بھائیوں کی مدد کرتے ہیں اور راہِ خدا میں صدقہ دیتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: یہ دنیا نہیں آخرت ہے (حبِ دنیا نہیں حبِ آخرت ہے)۔[1]

دوسرا مطلب:

طبیعی اور مصنوعی چیزوں سے تین قسم کا استفادہ ہو سکتا ہے:

۱۔ بقدرِ ضرورت، جس سے زندگی محفوظ رہے یا اتنا استفادہ جتنا شرعی

---

[1] روایت کا متن بحار الانوار، ج ۷، ص ۶۲ و ص ۱۰۶ پر موجود ہے اس کی سند دوسری جگہ ہے فی الحال یاد نہیں، البتہ سند صحیح ہے۔

نقطۂ نگاہ سے واجب ہے۔

۲۔ مزاج اور معمول کے لوازمات کے مطابق جتنی ضرورت ہو۔

۳۔ جتنا استفادہ ممکن ہو اور جینے کی ہوا و ہوس اور خواہشات نفسانی جتنے استفادہ کی متقاضی ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ استفادہ کی پہلی قسم ضروری اور ناگزیر ہے اس کے بغیر ہلاکت کا خطرہ ہے، جو خودکشی کے مترادف ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ استفادہ کی تیسری قسم چاہے حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے، قابلِ مذمت ہے اور دنیا کی مذمت میں جتنی بھی آیات اور روایات ہیں وہ اس استفادہ میں شامل ہیں۔[1]

استفادہ کی دوسری قسم محل بحث اور نزاع ہے آیا شرعاً حلال ہونے کی صورت میں "حیات طیبہ" اور "اعلیٰ زندگی" ہے یا "الحیاۃ الدنیا" کے ذیل میں آتی ہے، جو پست اور قابل مذمت ہے۔ آیا ایسے استفادہ کی طرف توجہ اور اس کے لئے کوشش کرنا درست ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں راقم کوئی قطعی نظریہ نہیں رکھتا۔ بلکہ بعید نہیں کہ ایسے استفادہ کی پہلی قسم سے ملحق کیا جائے اور آیات و روایات ان پر صادق نہ آئیں جن میں دنیا کی مذمت کی گئی ہے اس کی عمدہ دلیل اکثر ائمہ علیہم السلام کی زندگی ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ اکثر ائمہؑ کی زندگی پہلی نوعیت

---

[1] آل عمران: ۱۴-۱۵، انعام ۳۲، یونس ۲۴، ۵۸، نحل ۹۶، اسریٰ ۱۸، کہف ۴۵، قصص ۶۰، عنکبوت ۶۴، شوریٰ ۳۶، حدید ۲۰، منافقون ۹۔

کی نفی۔[۵] (جس میں بقدر ضرورت اور واجب پر اکتفا کیا جائے)۔

بہر حال اگر اسلام کی تاکید کے مطابق مسلمانوں کی زندگی سے استفادہ کی تیسری قسم ترک کر دی جائے اور اسلامی ذمہ اختیار کیا جاتا تو درج ذیل فوائد، معاشرہ اور افراد کے لئے بطور تحفہ میسر آسکتے تھے:

۱۔ ہر فرد کو دلی سکون ملتا اور مال و دولت کے حصول میں اتنی تھکن محسوس نہ ہوتی۔

۲۔ آخرت کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی جاتی۔

۳۔ شرعی فرائض، واجبات و محرمات، کی مخالفت کم ہوتی اور انسان اخلاقی اصولوں کے نزدیک ہو جاتا۔

۴۔ اقتصادی اعتبار سے معاشرہ کے طبقوں میں اتنا زیادہ فرق نہ ہوتا کیونکہ اقتصادی انصاف درہم برہم اور لوگوں میں فقر و ناداری کو عام کرنے والے اخراجات وہ نہیں جو احتیاجات اور ضروریات کو دور کرنے کے لئے کئے جاتے ہیں بلکہ وہ حکومتیں اقتصادی بدحالی کا باعث بنتی ہیں جو ہوا و ہوس

۵۔ امیرالمومنین کے علاوہ باقی ائمہ علیہم السلام کا طرز زندگی کا مطالعہ قارئین محترم کو اسی نتیجہ پر پہنچائے گا کہ ہمارے ائمہ علیہم السلام مال دنیا سے اتنے استفادہ کے پابند نہ تھے جس سے ان کی رمق حیات باقی رہتی اور ضرورت پوری ہوتی اس کے باوجود ان حضرات[ع] سے زہد اور پرہیزگاری کی نفی نہیں کی جاسکتی بنا بر این اگر کوئی ایسی نص اور صریح روایت مل جائے جو ظاہراً قسم دوم کو قسم سوم سے ملحق کرے تو اس کی تاویل و توجیہ کی جانی چاہیئے۔ یہ نکتہ محتاج بیان نہیں کہ لوگوں کی ضرورتیں اور احتیاجات بھی زمان و مکان اور بحران کے اعتبار سے بدلتی رہتی اور مختلف ہوتی ہیں۔

شہرت پرستی میں افراط، انتہا پسندی اور شیطانی افکار کی راہ میں لٹ جاتی ہیں ہماری بدبختی ہے آج کل دولت ظاہری چمک دمک اور بچوں کی سی خواہشات کی نذر ہو جاتی ہے۔

اگر ہمارے دل میں لازمی حد تک خدا کی محبت اور آخرت پر توجہ ہوتی اور دنیا کے فنا ہونے اور حساب و کتاب کو ہمیشہ یاد رکھتے تو استفادہ کی تیسری قسم سے کافی حد تک گریز کرتے اور اس کی بجائے محتاجوں اور معاشرہ کی احتیاجات کی طرف توجہ دیتے جس کے نتیجے میں سب کی زندگی آسودہ ہوتی یا کم از کم قابلِ برداشت ہوتی اور اس موجودہ رقت انگیز حالت سے نجات مل جاتی جو اکثر لوگوں کے لئے طاقت فرسا ہے۔

اگر ان فوائد اور دیگر فوائد کی طرف توجہ دی جائے تو نصوص اسلامی، روایات میں موجود حبِ مال کی مذمت اور زہد کی تعریف و تشویق کا راز واضح ہو جائیگا۔

تیسرا مطلب

اس دنیا میں موجود چیزیں۔ بیوی بچے، والدین، رشتہ دار، دوست، عام لوگ، سونا چاندی، لوہا، فرش، برتن، مکان کپڑے، گاڑی وغیرہ جو ہمیں نظر آتی ہیں ان میں سے کوئی بھی چیز بذات خود اچھی یا بری نہیں ہے بلکہ اس اعتبار سے سب اچھی ہیں کہ یہ تمام چیزیں خدا کی مخلوق ہیں۔

بجہان خرم از آن ام کہ جہان خرم از اوست
عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست

موجودات عالم دو جہت سے خوب یا بد (قابل مدح یا قابل مذمت) ہوا کرتی ہیں۔

۱۔ یہ موجودات اس اعتبار سے قابل مذمت اور تعریف ہوتی ہیں کہ ان سے کتنا استفادہ کیا جائے۔ اس موضوع پر کسی حد تک بحث ہوگئی ہے۔

۲۔ دلی محبت اور باطنی لگاؤ کے اعتبار سے دنیا قابل مدح یا مذمت قرار پاتی ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔

(۳ : ۱۴)

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ۔

(۳ : ۱۵)

(دنیا میں) لوگوں کو ان کی مرغوب چیزیں (مثلاً) بیویوں اور بیٹیوں اور سونے چاندی کے بڑے بڑے لگے ہوئے ڈھیروں اور عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتی کیساتھ الفت بھلی کر کے دکھادی گئی ہے۔ یہ سب دنیادی زندگی کے (چند روزہ) فائدے ہیں اور (ہمیشہ کا) اچھا ٹھکانہ تو خدا ہی کے ہاں ہے (اے رسول) ان لوگوں سے کہو کہ کیا میں تم کو ان سب چیزوں سے بہتر چیز بتا دوں (اچھا سنو) جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی ان کے لئے ان

کے ربّ کے ہاں بہشت کے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (اور وہ) ہمیشہ اس میں رہیں گے اور اس کے علاوہ ان کے لئے صاف ستھری بیویاں ہیں اور (سب سے بڑھ کر تو) خدا کی خوشنودی ہے اور خدا اپنے ان بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔

اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیَاۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ۔ (۹ : ۳۸)

کیا تم آخرت کے بدلے حیاتِ دنیا پر راضی ہو گئے۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ۔ (۱۴ : ۳)

دنیا کی (چند روزہ) زندگی کو آخرت پر (جو نعیم ابدی ہے) ترجیح دیتے ہیں۔

کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ۔ (۷۵ : ۲۰-۲۱)

کیا تم اس وقتی زندگی سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو ترک کرتے ہو۔

البتہ ان چیزوں سے محبت دو قسم کی ہو سکتی ہے:

۱۔ ایسی محبت جو خدا سے دور کرنے اور مراسم عبودیت کو ترک کرنے کا باعث ہے اور جس سے انسان اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ جائے، ایسی محبت حرام ہے اور اس کی مذمت کی گئی ہے۔ بلکہ بعض اوقات کفر کا باعث بنتی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ ایسی محبت باطنی، داخلی رشتے سے اپنا دل خالی کرے۔ یہ ایسی محبت ہے جس کی بہت سی آیتوں میں نہی کی گئی ہے۔

ایک روایت میں معصوم فرماتے ہیں:

"دو درندہ بھیڑیوں کا ضرر و نقصان جو دو اطراف سے بے محافظ ریوڑ پر حملہ آور ہوں، حب مال و مقام کے ضرر و نقصان سے زیادہ نہیں ہے جو یہ دین اسلام کو پہنچاتے ہیں۔"[1]

---

[1] یہ روایت تین سندوں سے نقل کی گئی ہے اگرچہ ہر سند انفرادی ←

ظاہراً اس روایت میں شرف و مقام سے مراد خود پسندی اور خود بینی ہے اس مضمون کی ایک اور روایت جس کی سند معتبر ہے، حبِ ریاست کے بارے میں بھی ہے اس روایت میں ریاست سے مراد ریاست و حکومت باطل (ظالم) ہو سکتی ہے یا مطلق ریاست. قرآن مجید فرماتا ہے :

"بہشت ان لوگوں کے لئے جو زمین پر بالا دستی اور فساد کا ارادہ تک نہ کریں "؛

البتہ احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے اور فساد و انحراف کو روکنے کے لئے ریاست سے محبت اور اس کے حصول کی کوشش عین عبادت ہے .

ایسی محبت جو احکامِ شرعی کی بجا آوری میں رکاوٹ ہو، اگر یہ محبت کسی کافر سے ہو تو حرام ہے اور کسی مؤمن سے ہو تو بہتر اور "راجح" ہوگی ، اگر یہی محبت بیوی اور شوہر میں (شہوت کی غرض سے ہو اور) مال و دولت (سونا چاندی) مکان جاہ و حشم ، زمین ، باغ ، سرمایہ وغیرہ سے ہو تو ہو سکتا ہے آیۂ اول زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ...الخ کے مطابق "مرجوح" اور نامناسب ہو. اگرچہ شرعاً ممنوع نہ ہو بلکہ یہ کسی حد تک طبیعی اور غیر اختیاری بھی ہے . تاہم بعض ایسے پاک نفوس ضرور ہیں جو ان (مادی) نعمتوں سے خوش ہوتے اور نہ ان کے فوت اور ضائع ہونے سے فکر مند ہوتے ہیں .

← طور پر ضعیف ہے، لیکن مجموعی طور پر روایت قابلِ عمل ہے ، اصولِ کافی ، ج ۲ کے اوّل کی طرف رجوع کریں . ۱؎ اس مسئلے کی تحقیق کے لئے حدود الشریعۃ فی محرماتہا حصہ اوّل کی طرف رجوع کریں .

لکیلا تا سوا علیٰ ما فاتکم و لا تفرحوا علیٰ بما اتاکم ۔ (۵۷ : ۲۳)

تاکہ جو چیز تم سے فوت ہو اس پر فکرمند نہ ہو اور جو چیز تمہیں ملے اس پر خوش نہ ہو جاؤ۔

چوتھا مطلب

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ نہایت ضروری ہے گزشتہ بیانات کے مطابق دنیا ایک ناپائدار اور بے وقعت چیز ہے اور ضرورت سے زیادہ اس سے لگاؤ نہیں رکھنا چاہیئے۔ انسان کی تمام تر فکر اور توجہ معارف، اخلاقیات اور عبودیت کے مراسم کی طرف ہونی چاہیئے اور عالم آخرت کی آبادی پر تمام تر قوتیں صرف ہونی چاہئیں، یہ لازمی امر ہے کہ اسطرح مسلمانوں کی دلچسپی اور توجہ، مادی علوم، سائنس میڈیکل اور ٹیکنالوجی وغیرہ پر سے مکمل طور پر ختم نہ ہو تو بہت کم ضرور ہو جائے گی۔ جس کے نتیجے میں اسلامی ممالک کے بازار اور منڈیاں کفار کی برآمدات سے بھر جائیں گی اور ہمارے نوجوان مادی علوم۔ سائنس وغیرہ کے حصول کے لئے دشمن ممالک کا رخ کریں گے جس سے وہ ایک عرصے بعد اگر کافر نہ ہوں تو دل برداشتہ ضرور ہو جائیں گے اور اسلام کو دنیا کے منافی سمجھنے لگیں گے اور آہستہ آہستہ اسلام کا مقابلہ کرنا شروع کر دیں گے[1] آخرکار مسلمانوں کی مادی کمزوری اس کا باعث بنے گی کہ یکے بعد دیگرے اسلامی ممالک استثمار اور استعمار کے تصرف اور

---

[1] یہی وجہ ہے کہ اس بیسویں صدی میں اسلامی ممالک نے اسلامی قوانین کو غیر قانونی قرار دیا ہے حتیٰ کہ انہیں فضول اور بے ہودہ سمجھا جاتا ہے ←

قبضے میں چلے جائیں گے ہمارا دین بھی تباہ و برباد ہوگا اور دنیا بھی اس طرح اخلاقی ضابطہ کی پیروی کا نتیجہ سو فی صد غلط اور برعکس برآمد ہوگا۔ [1]

یہ ایک ایسا موضوع ہے جو تاریخ اسلام میں قطعی تجربے سے ثابت ہے یہاں تک کہ اس کا انکار یا اس میں شک، تقدس اور ذہانت تو بجائے خود خیانت اور حماقت شمار ہوگی۔

آپ ہمارے دانش مندانِ اخلاق کی عبارتوں پر توجہ فرمائیں کہ انہوں نے اخلاق کے سیاسی، اقتصادی، مادی اور بین الاقوامی پہلوؤں کو کس طرح نظر انداز کر دیا ہے اور افراد کے صرف اخلاقی پہلو کو اہمیت دی ہے نیز تصوّف کے زیر اثر توازن اور اعتدال کے تحفظ میں کوتاہی کی ہے نمونے کے طور پر اخلاقیات کی ایک مشہور کتاب کی ایک عبارت پیش خدمت ہے:

← اور مسلمانوں کے تمام معاملات میں مغربی اور مشرقی کفار کے قوانین وضعی (خود ساختہ قوانین) ترقی پسند قوانین کے نام سے لاگو ہیں اور انہیں قانونی حیثیت دی ہے اور آخر کار دین سیاست سے جدا ہے کہ نعرے کی گونج میں دین کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے ایسی حکومتیں اصل کفار سے زیادہ اسلام کو نقصان پہنچا رہی ہیں یہی حکومتیں اصل کفار سے زیادہ خبیث اور پلید تھیں اور ہیں۔

[1] دوسرے الفاظ میں یہ اخلاقی صفت (ترکِ دنیا) ایک راجح، مستحب اور بہتر چیز ہے۔ واجب اور حتمی نہیں۔ یہ مسلم ہے کہ مستحبات اور واجبات میں کوئی ٹکراؤ نہیں مثال کے طور پر جب نمازِ شب، مؤمن کو ←

ویجب ان یکون سعیه فی امور الدنیا بقدر الضرورة ویحرم علیٰ نفسه تحصیل الزاید لانه لاشقاوة اشد من صرف الجوهر الباقی النورانی فی تحصیل الخزف الفانی الظلمانی الذی یفوت عنه وینتقل الیٰ اعدائه من الوارث وغیرهم۔

واجب ہے کہ دنیاوی کاموں میں انسان کی کوشش بقدر ضرورت ہو اور ضرورت سے زیادہ کو اپنے لئے حرام قرار دے کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی شقاوت اور بدبختی نہیں کہ اپنے ابدی اور نورانی جوہر (نفس و روح) کو اس ظلماتی اور فنا ہونے والے خس و خاشاک کے حصول میں صرف کرے جو آخر کار کسی نہ کسی دن اس کے اختیار سے نکل جائے گی اور اس کے وارثوں تک منتقل ہو جائے۔

کاش اس عبارت کے لکھنے والے آج زندہ ہوتے اور اقتصادی،

کھانا کھلانا، مستحب اذکار اور تحصیل علم کسی واجب کے ترک کا باعث بنیں تو ایسے مستحبات ترک کر دینے چاہئیں حتیٰ کہ واجبات بھی باہمی تزاحم و ٹکراؤ کی صورت میں قابلِ سقوط ہیں اور وہ واجب نہیں رہتے، نیز مہم اہم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اگر نماز یا روزہ کا حفظِ جان سے ٹکراؤ ہو تو یقیناً حفظِ جان مقدم ہوگا اور نماز یا روزے کا وجوب باقی نہیں رہے گا۔

سیاسی، اجتماعی اور فوجی اعتبار سے مسلمانوں کی ذلّت آمیز حالت دیکھتے اور کفار کے استعماری مظالم اور صنعتی معاشروں کے تسلّط کا مشاہدہ کرتے تو یقیناً اپنا نظریہ تبدیل کر دیتے اور اس قسم کی عبارتوں سے پشیمان ہوتے۔ ہمیں یہ ناقابلِ انکار حقیقت تسلیم کر لینی چاہیئے کہ آج کی دنیا میں انفرادی زندگی میں بھی دین کی حفاظت اور احکامِ اسلام کا نفاذ، فوجی، سیاسی، اقتصادی، صنعتی، تجارتی اور زرعی طاقت پر موقوف ومنحصر ہے اور احادیث کو مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس سلسلے میں قرآن بھی فرماتا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (۸ : ۶۰)

یعنی جتنا تم سے ہو سکے کفار کے مقابلے میں طاقتور بنو۔[۱]

بہرحال دنیا کی طرف توجہ دینا اور تجرباتی علوم (سائنس وغیرہ) یا مالِ دنیا کو حاصل کرنا بذاتِ خود مرجوح (ناپسند) ہے لیکن جب دین کی حفاظت ان چیزوں پر موقوف ہو تو وہ مطلوب قرار پاتا ہے بلکہ لازمی اور واجب ہو جاتا ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوان نسل کو دین و اخلاق

---

[۱] یہ دو آیات غور طلب ہیں:

اُنْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۱۰ : ۱۰۱)

آسمانوں اور زمین پر نظر ڈالو۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ۔ (۲۹ : ۲۰)

(ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ زمین پر سیر کرو اور دیکھو کہ خلقت کا آغاز کیسے ہوا۔

کے ساتھ ساتھ تجرباتی علوم کے حصول، پیداواری کارخانوں کی تاسیس اور صنعت و زراعت میں توسیع کا شوق دلایا جائے، چاہے اس طرح بعض لوگ حبِ دنیا کے دام میں گرفتار کیوں نہ ہو جائیں [1]

راقم کی نظر میں ان دونوں مہم چیزوں (پرہیزگاری اور حصولِ دنیا) کو باہم حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسلامی حدود اور فقہی اصولوں کے دائرے میں جہاں تک ہو سکے غیر ممالک کے ساتھ تجارت اور بھاری صنعتوں کی برآمد پر حکومت کا کنٹرول رہے خام مال بیت المال کے بجٹ سے خریدا جائے اور مورد استفادہ قرار پائے اور افراد کے ہاتھ سے خارج ہو جائے (بشرطیکہ یہ کام اسلام کی نگرانی میں انجام پائے اور بائیں بازو سوشلزم کے گمراہ کن وسوسوں کے زیرِ اثر قرار نہ پائے) تجارت کا یہ طریقہ" کار ایک لحاظ سے ملک کی اقتصاد کو تقویت پہنچائے گا اور دوسرے اعتبار سے لوگوں میں حُبِ مال، دنیا پرستی، طمع، لالچ، بخل، حسد اور تکبر کا باعث نہ بنے گا،

---

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خواتین اور لڑکیوں کو اسلامی حدود کے دائرے میں سیاسی، اجتماعی اور دفتری پروگراموں اور تشکیلات میں شامل کر لیا جائے بلکہ ان کو ان علوم کے حصول کا شوق دلایا جائے تاکہ وہ غلط طریقوں سے ان میں شرکت کے نتیجے میں مغربی اور مشرقی بے دینوں کی گود میں نہ جانے پائیں۔ مستورات پر صرف اس لئے سیاسیات میں حصّہ لینے کی پابندی لگانا کہ اس سے بعض جوان مرد اور عورتوں کے اخلاق و کردار داغ دار ہو جاتے ہیں، کوئی عقلمندی نہیں اس لئے کہ جہالت سے جو فسادات اور خرابیاں ہو سکتی ہیں وہ بدتر ہیں، اس کے علاوہ فتنۂ کالم اور داخلی فریب خوردہ ←

البتہ یہ کام اس صورت میں انجام پا سکتا ہے کہ ملک میں حکومت اسلامی ہو۔

یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ آیا حکومت مالک افراد کی طرح اقتصادی رونق برقرار رکھ سکتی ہے؟ دوسرے الفاظ میں آیا اقتصادی ترقی اور پیش رفت صحیح مقابلے کے بغیر حاصل ہو سکتی ہے؟

اس سوال کا جواب اہلِ فن سے طلب کیا جائے اگرچہ راقم کے تجربوں اور مشاہدوں کے مطابق بعض ممالک میں حکومتوں کی طرف صنعتوں اور تجارتوں کو قومیانے کا تجربہ کامیاب نہیں رہا۔

زہد ہی کے بارے میں

یہ مطلب بیان کیا جا چکا کہ "زہد" دل و اعضاء سے زائد از ضرورت دنیا کو ترک کر دینے کا نام ہے۔ بنا براین اگر کوئی شخص دنیا سے دلی لگاؤ کے باوجود اور دل پر جبر کر کے ترک دنیا اختیار کرے تو یہ زہد نہیں ہے بلکہ یہ تزہد (زاہدوں کی سی صورت بنانا) ہے[1]۔ اگر کوئی با آسانی اور بغیر کسی

← لوگ مختلف ناموں سے نہ صرف ان جوانوں کا اخلاق برباد کر دیتے ہیں بلکہ ان کے دین و شرف کو بھی برباد کر دیتے ہیں اور معاشرت میں اسلامی تربیت کو جڑ سے اکھاڑ دیتے ہیں۔

[1] گزشتہ مباحث میں بیان ہو چکا ہے بعید نہیں کہ احتیاج سے زیادہ کو ترک کرنا زہد کا مصداق ہو، چنانچہ ائمہ علیہم السلام کی زندگی اس کے ثبوت کے طور پر پیش کی گئی ہے۔

دلی خواہش اور لگاؤ کے محض آخرت کی خاطر دنیا کو ترک کر دے تو یہ درمیانہ زہد ہے[1] اور اگر بخوشی دنیا کو حقیر اور بے وقعت سمجھ کر ترک کر دے اس طرح نہیں کہ دنیا تو اس کی نظر میں اہمیت کی حامل ہو مگر آخرت کی خاطر جو دنیا سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے دنیا کو ترک کر دے، بلکہ دنیا اس کی نظر میں ایک مردہ مکھی اور آخرت یاقوت کا گراں بہا موتی ہو جن میں تقابل اور موازنہ کا تصور تک نہیں ہو سکتا کہ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کا سوال پیدا ہو، یہ زہد کا اعلیٰ درجہ ہے۔

زہد کی دوسری قسم

۱۔ اگر صرف محرمات کو ترک کر دیا جائے تو ایسا زہد فرض اور واجب ہے۔

۲۔ اگر محرمات اور مشتبہات (مشکوکات) دونوں کو ترک کر دیا جائے تو ایسا زہد سلامتی (کا باعث) ہے۔

۳۔ اگر انسان ضرورت سے زیادہ دنیا اور مالِ دنیا کو (اگرچہ حلال ہی کیوں نہ ہو) ترک کر دے تو ایسا زہد ثقیل (سنگین) ہے اگرچہ ضرورت کے مطابق استفادہ سے لذت محسوس کرے۔

۴۔ اگر بقدرِ ضرورت استفادہ سے لذت محسوس نہ کرے بلکہ مجبوری کے تحت استفادہ کرے، حتّٰی کہ مردار خوری کی طرح دنیا سے نفرت کرتا ہو تو زہد عالی ہو گا۔

---

[1] شاید شرعی زہد کا آخری درجہ یہی ہو۔

زہد کی اس قسم میں طبیعت کے تمام تقاضوں (شہوت، غضب، تکبر، ریاست، حکومت، مال و متاع اور جاہ و مقام) کو ترک کرنا داخل ہے۔

۵۔ اگر انسان ہر غیرِ خدا حتیٰ اپنی جان بدن تک کو ترک کردے تو یہ زہد کا آخری درجہ ہے۔[۱]

زہد کی تیسری قسم

اگر کوئی عذاب کے خوف سے دنیا کو ترک کرے تو یہ "زہد الخائفین" کہلاتا ہے۔

اور ثواب آخرت کی خاطر دنیا کو ترک کرنا "زہد الراجین" کہلاتا ہے۔

اور اگر خدا کی خاطر دنیا کو ترک کریں تو یہ "زہد العارفین" ہے۔

یہ اس بیان کا خلاصہ ہے جو مرحوم نراقی نے اپنی کتاب "جامع السعادات" میں پیش کیا ہے۔ شاید اس قسم کی عبارتیں اور جملے ان جیسے متقدم اور متاخر علماء کرام کی عبارتوں میں بھی مل جائیں۔

---

[۱] یعنی زہد کی انتہا یہ ہے کہ انسان دن اور رات کی قوت لایموت پر اکتفا کرے اور باقی راہ خدا میں صرف کردے پس اگر جنس قوت میں نانِ جویں پر اکتفا کی جائے تو یہ زہد کی انتہا ہوگی لیکن بعض اوقات گندم کی روٹی کھا لینا اور کبھی ایک سالن کھا لینا جو زیادہ لذیذ اور مزیدار نہ ہو حتیٰ کہ کبھی کبھار گوشت کھانا بھی زہد کے منافی نہیں ہے، زاہد کا اون اور روئی کا بنا ہوا ہونا چاہیئے جو اعضائے بدن کو چھپائے رکھے اور سردی اور گرمی

تیسری تقسیم پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں یہ صرف اصطلاح ہے بات یہ ہے کہ ترک دنیا برائے دنیا نہ ہو، جس میں بعض کم عقل اور ناداں مبتلا ہوتے ہیں (حسنہ الدنیا والآخرہ") البتہ دوسری تقسیم قابل بحث ہے اور راقم کی نظر میں اس کی چوتھی قسم صحیح نہیں ہے چہ جائیکہ پانچویں قسم صحیح ہو کیونکہ کوئی عاقل یہ احتمال نہیں دیتا کہ انبیاء اور اوصیاء علیہم السلام نے ضرورت سے زیادہ غذا کھاتے وقت بھی اکل میتہ (مردار کھانے) کی سی دلی نفرت محسوس کی ہوگی اور شاید کوئی انسان زہد کی اس منزل تک نہ پہنچے۔ قرآن مجید نے حلال غذاؤں کو "طیبات" پاکیزہ قرار دیا ہے اکل مردار نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ خدا کے نزدیک دنیا گندگی کے ڈھیر میں پڑی کان کٹی مردہ بکری سے بھی پست ہے[1] لیکن یہ بات دلیل نہیں بنتی کہ انسان کے نزدیک بھی یہ اتنی ہی پست ہو۔ ہاں! اگر کسی صحیح اور معتبر سند سے یہ ثابت ہو کہ معصومؑ کے

← سے محفوظ رکھے، اگر دو جوڑے کپڑے رکھتا ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ زاہد کا دیگر سامان بھی اتنا ہونا چاہیئے کہ جس سے ضرورت پوری ہو جائے جب دن رات کا خرچہ بقدر ضرورت حاصل کرتا ہو اور معاش کو چھوڑ کر دینی امور میں مشغول ہو جائے اور اگر سال کا نفقہ بھی رکھتا ہو تو بھی ظاہراً زہد سے خارج نہیں ہوتا، بشرطیکہ ضرورت سے زیادہ کو صدقہ کے طور پر دے دے۔ مزید ضرورت کے مطابق اجتماعی مقام اور حیثیت بھی حاصل کر سکتا ہے شہوت اور وسوسہ شیطانی کے ازالے کی حد تک شادی وغیرہ بھی کی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ بعض علماء نے یہی فرمایا ہے۔

[1] یہ مضمون سند صحیح کے ساتھ رسول اکرمؐ سے منقول ہے۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۱۹۶

نزدیک دنیا سے ہر قسم کا استفادہ اور احتیاج کی تمام چیزیں خنزیر کے اس گوشت سے بھی بدتر ہیں جو کسی مجذوم کے ہاتھ میں ہو، پھر بھی معصومین[ع] یا بعض معصومین[ع] کا حکم مختلف ہوگا۔ لیکن شاید کسی معتبر طریقے سے یہ بات ثابت نہ ہو۔[1] حقیقت یہ ہے کہ کامل مسلمان خدا کی خاطر پوری دنیا کو بھی نظر انداز کرے تو اسے یہ بات شاق اور گراں نہیں گزرنی چاہیئے چنانچہ بعض ایسے حضرات موجود ہیں جو اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کی رضا اور خوشنودی کی خاطر مال کثیر سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور اس مال سے محبت کے باوجود یہ بات ان پر شاق اور گراں نہیں گزرتی بلکہ ایسا کر کے وہ دلی مسرت محسوس کرتے ہیں۔

اگر گردشِ زمانہ سے کوئی نقصان ان کو پہنچے تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مؤمن ناراحت اور پریشان نہیں ہوتا کیونکہ حکیم اور ارحم الراحمین ذات کی تقدیر یہی ہے:

امام جعفر صادق[ع] صحیح جمال میں فرماتے ہیں:

لا یجد عبد طعم الایمان حتیٰ یعلم ان ما اصابہ لم یکن لیخطئہ وان ما اخطأہ لم یکن لیصیبہ وان الضار النافع ھو اللہ۔[2]

کوئی بھی مؤمن اس وقت تک ایمان کا مزہ (شیرینی) نہیں چکھ سکتا جب تک اس کا یہ عقیدہ نہ ہو کہ جو مصیبت اور آفت اس پر نازل ہوئی ہے وہ کبھی بھی ٹل نہیں سکتی تھی اور جو مصیبت و آفت

---

[1] راقم کی نظر میں انبیاء و ائمہ طعام و جماع وغیرہ سے لذت محسوس کرتے تھے۔
[2] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۹۸۔

اس پر نازل نہیں ہوئی وہ نازل ہو ہی نہیں سکتی ۔

شاید آیۂ کریمہ :

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتَاكُمْ۔ (۵۷ : ۲۳)

تا کہ ان چیزوں پر رنجیدہ نہ ہو جو تمہیں میسر نہیں اور ان چیزوں سے خوش نہ ہو جو تمہیں نصیب ہوئی ہیں ۔

آیت میں ذکر شدہ خوشی اور رنج سے مراد رنج کثیر اور فرطِ مسرت ہے صرف رنج اور خوشی نہیں، تاکہ کسی حد تک حب دنیا کے منافی نہ ہو ، اس احتمال کی تائید میں دو شاہد (دلائل) پیش کئے جاسکتے ہیں :

۱۔ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۔ (۷۶ : ۸)

یعنی ، طعام سے محبت کے باوجود مسکینوں اور یتیموں اور اسیروں کو راہِ خدا میں کھانا کھلا دیتے ہیں ۔[1]

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (۳ : ۹۲)

تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک محبوب چیزوں میں سے راہ خدا میں خرچ نہ کرو ۔

یہ دونوں آیتیں صرف اہل بیتؑ سے مختص نہیں ہیں بلکہ اس میں تمام مسلمان شامل ہیں ۔

دوسرے یہ کہ شکر منعم تمام بندوں بلکہ انبیاء اور اولیاء علیہم السلام پر بھی واجب ہے اگر خدا کی دی ہوئی چیزیں محبوب نہ ہوں بلکہ مردار کی طرح ان سے

---

[1] یہ ترجمہ اس صورت میں صحیح ہوگا جب علیٰ حبہ کی ضمیر طعام کی طرف لوٹے خدا کی طرف نہ لوٹے ۔

نفرت ہو تو یہ چیزیں نعمت نہیں کہلائیں گی اور نہ شکر کا کوئی مقام ہوگا۔

زہد معتبر روایات کی روشنی میں

۱۔ امیرالمؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان من اعون الاخلاق علی الدین الزھد فی الدنیا[1]

دین کے لئے مددگار بہترین اخلاق دنیا میں زہد و پرہیزگاری ہے۔

۲۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

ثواب آخرت کا شوق اور رغبت رکھنے والے کی علامت یہ ہے کہ وہ دنیا میں زاہد اور پرہیزگار ہوگا اس دنیا میں زاہد کا زہد اس چیز کو ہرگز کم نہیں کر سکتا جو خدا کی طرف سے اس کی قسمت اور مقدر میں ہو اور نہ لالچی آدمی کا لالچ اس کی قسمت میں اضافہ کر سکتا ہے، گھاٹے اور خسارے میں وہ آدمی ہے جو آخرت کے حصے سے محروم ہو۔

۳۔ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

موت کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو کیونکہ جو آدمی موت کو یاد کرتا ہے اسے دنیا میں زہد حاصل ہوتا ہے۔[2]

۴۔ امام جعفر صادق علیہ السلام رسول اللہ ص سے روایت فرماتے ہیں:

طلب دنیا میں آخرت کا نقصان ہے اور طلب آخرت میں دنیا کا، یہ اس صورت میں ہے جب دنیا و آخرت میں ٹکراؤ ہو (یعنی آخرت کے مقابلے

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۹۴۔
[2] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۹۸۔

میں دنیا حرام ہو) دنیا کو نقصان پہنچاؤ آخرت کو نہیں۔ دنیا اس قابل ہے کہ اسے نقصان پہنچایا جائے[1]

۵۔ امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

الا ان الزاهدين فى الدنيا تخذوا الارض بساطا والتراب فراشا والماء طيبا وقرضوا الى الدنيا تقريضا[2]

دیکھو دنیا میں زاہدین کا فرش زمین، ان کے بستر اس کی خاک، ان کا لذیذ کھانا پانی ہوا کرتا ہے اور وہ دنیا سے بالکل کٹے ہوتے ہیں۔

روایت کا یہ مضمون اور اس جیسے دیگر مضامین ائمہ علیہم السلام کے اپنے طرز زندگی کے منافی ہیں اس لئے ان روایات کی تاویل کرنا پڑے گی۔ مثال کے طور پر امام سجادؑ کی مراد یہ ہو گی کہ زاہدین اچھے فرش اور عمدہ کھانوں کے پابند نہیں ہوا کرتے۔ کبھی کبھی خاک پر بھی سو جایا کرتے ہیں انہیں جب کھانا میسر نہ ہو تو پانی پینے پر اکتفا کرتے ہیں اس طرح دنیا سے کٹے ہوئے ہیں۔ واللہ عالم ولہ الحمد۔

۵۔ جاہ و مقام و شہرت سے محبت نہ ہونا[3]

جاہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی عزت اور اطاعت کے لئے دوسرے کا دل موہ لے۔ دوسرے الفاظ میں انسانی معاشرے میں مقام حاصل کرنے کے

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۹۸

[2] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۱۹۔

[3] یہ بحث بھی زہد کی مباحث میں شامل ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا علیحدہ اور مستقل ذکر کیا گیا ہے۔

لئے لوگوں کے دلوں میں گھر کرے۔

شہرت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں کسی کی عظمت کا عام چرچا ہو۔

کسی کو شہرت اور جاہ و مقام حاصل ہونے کا سبب یہ ہے کہ عام لوگ کسی فرد میں کسی صفت کے معتقد ہوں۔ جسے وہ ایک کمال کے طور پر تسلیم کرتے ہوں، جیسے علم، تقوٰی، شجاعت، دولت، حسن و جمال، قدرت و منصب اور اس جیسے دوسرے اوصاف جن سے لوگوں کی توجہ صاحبِ صفت کی طرف مبذول ہو، بلکہ وہ اس کے مطیع و فرمان بردار بن جائیں۔ انسان کو فطری طور پر اپنی ذات اور اس چیز سے محبت ہوتی ہے جو اس کے لئے مفید ہو اور وہ ہر اس چیز کا مخالف و دشمن ہوتا ہے جو اس کے لئے مضر اور نقصان دہ ہو۔ بنا براین یہ چیز انسان کی طبیعت میں داخل ہے کہ وہ شہرت پسند اور جاہ طلب ہوتا ہے۔

فقہی نقطۂ نگاہ سے فعل حرام پر راضی ہونا بھی حرام ہے۔ اگر حبِ ریاست و شہرت کا انجام مبغوضِ الٰہی قرار پاتا ہو (حبِ ریاست پر خدا راضی نہ ہو) تو وہ ناجائز اور حرام ہوگی، اگر اس حبِ ریاست کا نتیجہ مکروہ شرعی قرار پائے تو یہ مکروہ ہوگی اور اگر کوئی شخص اس لئے شہرت پسند اور ریاست طلب ہو تاکہ اس کے ذریعے دین کی حفاظت اور احکام اسلام کو نافذ کر سکے یا مسلمان کو ضرر اور نقصان سے بچا سکے یا اسے نفع اور فائدہ پہنچا سکے تو ایسی محبت قابلِ مدح و تعریف بلکہ بعض اوقات واجب ہو جاتی ہے۔

یوسف صدیق علیہ السلام اپنے وقت کے حاکم اور زمام دار سے فرماتے ہیں:

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ۔ (۱۲ : ۵۵)

زمین کے خزانے (مملکت کے خزانے) میرے سپرد کر دو میں ایک محافظ

اور دانا انسان ہوں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی تعریف کر کے حاکم وقت کا دل موہ کر اسے اپنے اعتماد میں لینا چاہتے ہیں تاکہ اس طرح اسے اپنے قبضے میں لے لیں اور خود سر پرست بن جائیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فقہی نقطہ نگاہ سے شہرت طلبی اور حب ریاست کا حکم غرض اور مقصد کے تابع ہے اگر غرض اور مقصد نیک ہو تو حب ریاست بھی نیک اور جائز (بلکہ کبھی واجب) ہوگی اور اگر غرض اور مقصد برا ہو تو حب ریاست بھی بری (کبھی حرام اور کبھی مکروہ) ہوگی[1]۔

فی الحال زیر بحث یہ ہے کہ جس حب جاہ اور شہرت کا مقصد مباح ہو (راجح ہو نہ مرجوح) ایسی حب جاہ آیا شرعاً مذموم ہے یا نہیں؟ بنیادی طور پر حب جاہ سے قطع نظر ایسے مقام کی طلب (حصول کی کوشش) کا حکم کیا ہے جواب کے لئے ان معتبر نصوص کی طرف رجوع فرمائیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۔ (قصص: ۸۳)

دار الآخرت ان لوگوں کو نصیب ہوگا جو روئے زمین پر بلندی اور فساد کا ارادہ تک نہ کریں۔

اس آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر قسم کی بلندی اور فساد کا ارادہ مذموم ہے اس لئے کہ اس آیہ میں نکرہ (غیر معین اسم) "علواً" نفی "لا یریدون" کے بعد واقع

---

[1] اگر طلب ریاست بہتر ہو تو اس سے محبت میں بھی کوئی حرج نہیں۔

ہوا ہے جو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ البتہ اس علو اور بلندی کا ارادہ مستثنیٰ کیا گیا ہے جو احکامِ دین کے نفاذ یا مسلمانوں کی مدد کے لئے کیا جائے۔ باقی ارادے اس عموم کے تحت داخل ہوں گے یعنی سب مذموم ہوں گے۔

ہو سکتا ہے کہ لفظ "فساد" کے ذکر میں اس بات کا قرینہ ہو کہ اس "علو" (بلندی) سے مراد علوِ باطل ہو اور علو مباح شامل نہ ہو اس طرح علوِ مباح کا ارادہ مذموم نہ ہو۔ خصوصاً آیۂ کریمہ کا قارون کے واقعہ کے تتمہ کے ساتھ نازل ہونا اس بات کا شاہد ہے کہ ہر علو مذموم نہیں بلکہ علوِ باطل مذموم ہے۔

۲۔ ان آیات کے اطلاق کی طرف توجہ کی جائے جن میں حیاتِ دنیا کی مذمت کی گئی ہے اس لئے کہ جاہ و مقام اور شہرت بھی حیات اور زینت دنیا کے ذیل میں آتے ہیں ایسے جاہ و مقام کی محبت بھی مذموم ہے۔

۳۔ وہ روایت جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ دین میں حبِ مال و شرف اس بھیڑیئے سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے جو بے محافظ بکریوں کے ریوڑ پر حملہ آور ہو۔ ظاہر ہے حبِ شرف میں حبِ جاہ و شہرت بھی شامل ہے۔

۴۔ صحیحہ معمر میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"دو درندہ بھیڑیئے بے محافظ ریوڑ کو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا ریاست طلب انسان، دین کو پہنچا سکتا ہے۔"[1]

اور بحار میں ہے:

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۴۰۵۔

"طلب ریاست سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز نہیں ہے۔"

رجال کشی میں بحار سے یوں منقول ہے:

"بے محافظ ریوڑ پر حملہ آور ہونے والے دو بھیڑیوں کا نقصان اس نقصان سے زیادہ نہیں جو حبِ ریاست سے دین کو پہنچ سکتا ہے۔"[1]

۵۔ صحیحہ محمد بن مسلم میں امامؑ فرماتے ہیں:

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے اچھوں اور بُروں کی تمیز نہیں؟ کیوں نہیں! خدا کی قسم تم میں سے بُرے وہ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے پیچھے پیچھے چلیں ایسے لوگ چار و ناچار جھوٹ بولیں گے یا ضعیف الرائے ہوں گے۔"[2]

۶۔ صحیحہ عبداللہ بن مسکان میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان رئیسوں (حاکموں) سے پرہیز کرو جن کا پیرہن ریاست ہے۔ خدا کی قسم جس شخص کے پیچھے لوگوں کی جوتیوں کی آواز سنائی دے وہ ہلاک ہوگیا اور دوسروں کو بھی ہلاک کر دے گا۔"[3]

ان روایات کا اطلاق اس حبِ ریاست و جاہ پر بھی ہوتا ہے جس کی

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۱۵۴۔

[2] اصولِ کافی، ج ۳، ص ۴۰۷ روایت کے آخری جملے کے ترجمہ کے لئے بحار، ج ۷۳، ص ۱۵۲ کی طرف رجوع کریں۔

[3] اصول کافی، ج ۳، ص ۴۰۶۔

غرض مباح ہو۔ واللہ الموفق و المدد۔

اس بحث کے آخر میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ اگر واجبات یا مستحب عبادات میں ریاکاری کے ذریعے ریاست اور مقام طلب کیا جائے تو حرام شدید و مؤکد اور شرک اصغر ہوگا اور اگر ریاست طلبی، توصلیات (جن میں قصد قربت اور نیت ضروری نہ ہو جیسے نجس لباس کو پاک کرنا وغیرہ) میں ریاکاری کے ذریعے کی جائے تو یہ محلِ بحث (اختلافی مسئلہ) ہے۔ حدود الشریعہ فی محرماتہا کی جلد ۱ حرف "ر" میں ملاحظہ فرمائیں۔

اگر ریاست طلبی اخلاقی فضائل کے استحکام اور شعائرِ دین کے تحفظ کی غرض سے ہو تو مستحب ہوگی اور اگر روئے زمین پر دینِ خدا کے قیام کی خاطر ہو تو واجب مؤکد ہوگی۔

۶۔ بغضِ معصیت

کفر، نفاق، شرک، فعل حرام اور ترک واجب جیسی چیزوں سے جس طرح خدا کو نفرت ہے اسی طرح بندوں کو بھی نفرت ہونی چاہیئے۔ روایات بتاتی ہیں کہ راہِ خدا میں محبت اور راہِ خدا ہی میں بغض (کسی سے دشمنی) ایمان کی تکمیل کا باعث ہے۔ بنا بر این حب اطاعت اور حبِ محبوب خدا ممدوح ہے۔

عقلی طور پر معصیت پر راضی ہونا مولا کے حضور میں بے ادبی، جرأت اور عبودیت کے اصولوں سے ایک قسم کا انحراف ہے اور فقہی نقطۂ نظر سے حرام ہے۔

اس لئے روایت صحیحہ میں وارد ہے کہ لوگوں کی ایک جماعت نے حضرت نوحؑ کی تکذیب نہیں کی تھی لیکن محض اس بنا پر غرق ہوگئی کہ وہ ان کے عمل پر راضی

ہوئی جنہوں نے تکذیب کی تھی۔

و سائرھم اغرقوا برضاھم بتکذیب المکذبین و من غاب عن امر فرضی بہ کمن شاھدہ واتاہ۔[1]

"جو شخص کسی عمل پر راضی ہو تو اس طرح ہے جیسے اس نے خود وہ عمل انجام دیا ہے۔"

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ (۲۴ : ۱۹)

"جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ صاحبان ایمان میں برائی کا رواج عام ہو وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔"

لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ نہ اپنی معصیت پر راضی ہوں اور نہ دوسروں کی معصیت پر۔ بلکہ معصیت کی آرزو اور تمنا بھی مولا کے خلاف جرأت متصور ہوگی اور یہ بات عقلی طور پر باعث عذاب ہے۔

خداوند تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ (۲:۲۸۴)

تمہارے دلوں میں جو کچھ بھی ہے چاہے تم اسے ظاہر کرو چاہے اسے مخفی رکھو خدا اس کا مواخذہ اور محاسبہ فرمائے گا۔

شاید اس آیۃ کریمہ میں دل میں موجود چیز سے مراد معصیت کی تمنا اور آرزو ہے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۵۴، ص ۲۹۵۔ حدود الشریعۃ فی محرماتہا ج ۱، ص ۲۳۰۔

ثمالی امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کرتے ہیں: سب سے کم درجے کا ناصبی کون ہے (وہ ناصبی جو کتے سے زیادہ پلید اور ناپاک ہے) آپؑ نے فرمایا: وہ آدمی ہے جو ایک رائے قائم کرے (بدعت ایجاد کرے) اور اسی سے حُب و بغض رکھے۔ (وسائل، ج ۱۱، ص ۵۱۰)۔ اسی لئے حصول حرام کی دعا اور لوگوں کے لئے بد دعا اور نفرین کو (شرعاً) ممنوع قرار دیا گیا ہے۔[۱]

اس جنایتکار (مجرم) سے ہمدردی اور دلسوزی بھی حرام قرار دی گئی ہے جو سزا کا مستحق ہو۔

ولا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر۔ (۲۴ : ۲)

اگر تم خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکم خدا (سو کوڑے مارنا) کے نافذ کرنے میں تم کو ان (زناکار مرد اور عورت) کے بارے میں کسی طرح کے ترس کا لحاظ نہ ہونے پائے۔

یہاں تک کہ حدود کو ساقط (معاف) کرنے یا ان میں کسی کی شفاعت اور سفارش بھی حرام قرار دی گئی ہے۔

اللّٰھم طھّر انفسنا من کل مالیس فیہ رضاکَ۔

معصیت کی آرزو سے بدتر ظلم میں ظالم کی مدد کرنا اور معصیت میں کسی سے تعاون کرنا ہے:

---

[۱] حدود الشریعہ، ج ۱ مادہ دعا۔

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

نیکی میں لوگوں سے تعاون کرو اور برائی میں نہیں۔ (۵ : ۲)

امام رضا علیہ السلام کے فرمان کے مطابق ظالمین کی مدد کرنا گناہانِ کبیرہ میں سے ہے[۱]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو کسی مظلوم کے خلاف ظالم کی مدد کرے اس پر غضب الٰہی نازل ہوگا"[۲]

یہاں تک کہ جو آدمی ظالموں کے لئے قلم تراش کر دے یا کوئی تھیلہ بند کر دے وہ انہی (ظالموں) کے ساتھ محشور ہوگا۔ معصیت میں تعاون تو بجائے خود امام علیہ السلام نے کسی مسجد کی تعمیر میں بھی ظالموں کی مدد سے نہی فرمائی ہے[۳] اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے حدود الشریعہ کی طرف رجوع فرمائیں[۴]

۷۔ حق کی حمایت

مسلمان کو حق کا محب اور حامی ہونا چاہیئے:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (۲ : ۴۲)

(اے بنی اسرائیل) حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو

۱؎ وسائل، ج ۱۱، ص ۳۴۵
۲؎ وسائل، ج ۱۱، ص ۲۶۱۔

۳؎ وسائل، ج ۱۲، ص ۱۳۰

۴؎ حدود الشریعہ، جزو ۲ مادہ اعانہ از ص ۴۰ تا ص ۴۷۔

جانتے ہوئے اسے چھپاؤ جو لوگ واضح نشانیوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں (جبکہ ان کا کتاب خدا میں ذکر ہو چکا ہے) ان پر خدا اور دوسرے لعنت بھیجنے والے لوگ لعنت بھیجتے ہیں۔"

(بقرہ ۲: ۴۲ و ۱۵۹)

گناہان کبیرہ میں حق کی شہادت کو چھپانا اور باطل گواہی دینا شامل ہے یہ دونوں موضوع تفصیل کے ساتھ فقہی کتب میں موجود ہیں۔

(حدود الشریعہ، ج ۲ مادہ کتمان)

حق کی حمایت کے مصادیق میں سے ایک مصداق، کمال، اس کے حصول اور کاملین سے محبت ہے حق کی حمایت کا دوسرا مصداق طاقتور لوگوں کے مقابلے میں ضعیف و کمزور طبقہ، حکومتوں کے مقابلے میں عوام، اور بڑی طاقتوں (سپر پاورز) کے مقابلے میں ضعیف قوموں کی حمایت اور نفع میں عدالت اجتماعی کے تقاضے پورے کرتا ہے۔

۸۔ قناعت

اگر اچھے اور نیک طریقے سے مال حاصل کرنے کا نام ہو تو یہ "حرص" کے مقابل ہوگی اور اگر قناعت کی تفسیر یہ کی جائے کہ انسان دوسروں کے ہاتھ میں موجود چیزوں سے بے نیاز ہو تو یہ طمع کے مقابلے میں ہوگی۔

بنا براین قناعت کے دو مصداق ہیں:

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ (۲۰: ۱۳۱)

تم اس حیاتِ دنیا کی ظاہری چمک دمک کی طرف لالچ کی نگاہ سے نہ دیکھو جس سے ہم نے بعض کفار کو نوازا ہے تاکہ اس کے ذریعے انہیں آزمالیں تیرے ربّ کا رزق بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

مرحوم کلینی نے قناعت کے بارے میں جو گیارہ روایات ذکر کی ہیں ان میں سے دو کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں:

۱۔ روایتِ صحیحہ میں امیرالمؤمنینؑ فرماتے ہیں:

"اے فرزندِ آدم! اگر دنیا اتنی چاہو جو تمہارے لئے کافی ہو تو اس کی تھوڑی اور معمولی چیز بھی تمہارے لئے کافی ہے اور اگر اتنی چاہو جو تمہارے لئے کافی نہ ہو تو پھر ساری دنیا بھی کم ہے۔"

۲۔ من قنع بما رزقہ اللہ فھو من اغنی الناس

جو کوئی خدا کے دئے ہوئے رزق پر قناعت اور اکتفا کرے وہ سب سے زیادہ دولت مند ہے۔

دونوں جملوں میں حرص اور طمع میں مفاسد اور نقصانات کی طرف اشارہ ہے، جن سے اکثر لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں دوچار ہو جاتے ہیں۔

تین روایات "کافی" کے دیگر مقامات سے بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ ابن سنان روایتِ صحیحہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

"شرف المؤمن قیام اللیل وعزہ استغناؤہ عن الناس"

"مؤمن کا شرف شب بیداری (عبادت شب) اور اس کی عزت لوگوں سے بے نیازی میں ہے۔"

۲۔ الامام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"طلب الحوائج الی الناس استلاب للعز ومذھبۃ للحیاء والیأس مما فی ایدی الناس عز للمؤمن فی دینہ والطمع ھو الفقر الحاضر"

لوگوں سے حاجت طلبی اپنی حیاء اور عزت کو برباد کرنا ہے لوگوں کے ہاتھوں میں موجود مالِ دنیا سے نا امیدی اور مایوسی مؤمن کے دین کی عزت ہے، طمع اور لالچ آمادہ اور تیار شدہ فقر و ناداری ہے"

۳۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اصول الکفر ثلاثۃ۔۔۔"

"کفر کی بنیادیں تین ہیں، لالچ، تکبر اور حسد" حرص" نے آدمؑ کو اس درخت کا میوہ کھانے پر اکسایا جس کو کھانے سے انہیں روکا گیا تھا" تکبر" شیطان کا کام تھا جس کی وجہ سے اس نے حضرت آدمؑ کی تعظیم کے لئے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، جس کا اسے حکم دیا گیا تھا۔" حسد" حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں تھا جس کی وجہ سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا [1]

قناعت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے مناسب ہے کہ ان دو مطالب کی طرف رجوع کریں جو زہد کے باب میں بیان کئے گئے ہیں۔

ضرورت سے زاید اور احتیاج کی چیزیں حاصل کرنا جو ہوس کی حد تک

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۲۰۸ اور ۳۹۶، ج ۴ ص ۹ کی طرف رجوع کیجئے۔

نہ پہنچے قناعت کے منافی نہیں ہے۔ اور حرص شمار نہیں کی جاتی۔

۲۔ بین الاقوامی ملحد استعمار کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کی تقویت کی خاطر مال و دولت جمع کرنا حسنِ قناعت سے کئی درجے اہم ہے۔

۹۔ بلند ہمتی

پست ہمتی نچلے درجوں پر اکتفا کرنے اور معمولی چیزوں کو اہمیت دینے سے کوئی شخص منزلِ مقصود تک نہیں پہنچتا، یہ ابتداء یا وسطِ سفر میں ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

بلند ہمتی کی بعض دانشمندوں نے یہ تعریف کی ہے:

"سعادت و کمال کے حصول اور عالی مقاصد کے طلب کی کوشش کا ملکہ، نفس میں راسخ ہو جانا"۔

اخلاقی کمال، اجتماعی عزت اور انسان کے اطمینانِ قلب میں بلند ہمتی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

نظر آنانکہ نہ کردند دراین مشت خاک
الحق انصاف تواں داد کہ صاحب نظرند
ما رہرواں بخلوت شب چوں سفر کنیم
بر تاج خسرواں بحقارت نظر کنیم

اگر کوتاہ نظر اور پست ہمت افراد درس بھی پڑھیں تو متوسط درجہ کے عالم بھی نہیں بن سکتے کیونکہ یہ لوگ چند مطالب اور مسائل کے سمجھنے پر اکتفا کرتے ہیں اگر انہیں معمولی سا نقصان پہنچے اور دھچکا لگے تو عرصے

تک اس معمولی نقصان وضرر کا غم اور ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی سے معمولی بدی دیکھ لیں تو مدت دراز تک اس کا کینہ دل سے نہیں نکلتا اور یہ احتمال بھی ضعیف ہے کہ وہ کسی کی زیادتی سے درگزر کریں یہاں تک کہ اکثر اوقات گالی گلوچ، جھوٹ، تہمت اور بدگوئی پر اتر آتے ہیں۔ اگر کسی پر احسان کریں تو احسان جتا کر اس کے روحانی اور اجتماعی آثار ختم کر دیتے ہیں، جس پر احسان کرتے ہیں اسے پشیمان اور قرآن کو ناراض کر دیتے ہیں (قرآن کی مخالفت کرتے ہیں)

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۔ (۲ : ۲۶۴)

احسان جتا کر اور اذیت دے کر اپنے صدقات کو باطل نہ کرو

اگر پست ہمت افراد معاشرے میں محترم اور محبوب (ہر دلعزیز) ہونا چاہیں تو ہرگز نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ لوگ، پست ہمت افراد سے ہمیشہ نفرت کرتے ہیں ایسے لوگ خدا کا قرب بھی حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ یہ لوگ دو رکعت نماز پڑھ کر یا دو چار پیسے خرچ کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عبودیت کی آخری منزل تک پہنچ گئے ہیں اور ایک سو ایک کرامات کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ خیال کرتے ہیں کہ ملائکہ۔ فرشتے، تالیاں بجا بجا کر ان کا استقبال کریں گے۔

قارئین محترم! جب آپ کوتاہ نظر اور بلند ہمت انسانوں کے تاریخی واقعات پڑھیں یا سنیں گے تو کوتاہ نظر اور پست ہمت افراد حقیر اور بلند ہمت افراد محترم اور پرکشش نظر آئیں گے، یہ خدا داد عقل کا کام ہے کہ جو کوتاہ نظری کو برا اور بلندی کو اچھا سمجھتی ہے۔

حالات قلب کی بحث میں "نفس مطمئنہ" کی تفسیر کرتے ہوئے چند جملے ذکر کئے گئے جن کا اس بحث سے ربط ہے ان کا مطالعہ یہاں پر بے فائدہ نہ ہوگا۔[1]

راقم اس مخلوق (قلب) کے بارے میں جو کچھ کہے اس کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

اس صفت شریفہ (بلند ہمتی) کا مظاہرہ اتنے تکرار سے ہو کہ بلند ہمتی کا ملکہ (نفس انسانی میں راسخ ہونا) حاصل ہوجائے۔ واللہ الفیاض۔

اسلامی تعلیمات جو بلند ہمتی کے حصول میں ممد ثابت ہو سکتی ہیں، میں ریا کاری کی شدید مذمت ہے، یعنی مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی عبادات دوسروں کو دکھانے اور سنانے کی غرض سے انجام نہ دے اور اس کی تمام تر ہمت اور محنت دوسروں کو راضی رکھنے کے لئے نہ ہو۔ ریا اور سُمعہ (اوروں کو دکھانا اور سنانا) کی حرمت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نظر میں خدا کے علاوہ کوئی اور نہ ہو۔

۱۰۔ صبر و تحمّل

قرآن مجید میں صبر اور اس مادہ (ص۔ب۔ر) سے بنے ہوئے الفاظ سو سے زیادہ جگہوں پر استعمال کئے گئے ہیں جن سے اسلام میں صبر

[1] وہ آیات جو حیاتِ دنیا کی بے وقعتی اور اس کی فنا کے بارے میں ہیں اور وہ روایات جو حسد و کینہ اور بدبینی کی مذمت اور عفو و درگذر اور ایثار (خود پر دوسروں کو ترجیح دینا) کی تاکید کرتی ہیں یہ سب بلند ہمتی کے حسن و کمال پہ دلالت کرتی ہیں۔

کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے، ہم اس مقام پر صبر کے کچھ آثار اور امتیازات (جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے) قارئینِ محترم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں.

۱۔ صبر پیغمبروں کی صفت ہے.
۲۔ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ روزِ قیامت صابرین پر فرشتوں کا سلام ہوگا.
۳۔ صبر اچھا ہے.
۴۔ صبر کا صلہ بہتر ہے.
۵۔ صبر کا صلہ بہشت کے کمرے ہیں. (خصوصی انتظامات کے ساتھ)
۶۔ صبر کا اجر دوگنا ہے.
۷۔ صبر قیادت و امامت کا باعث ہے
۸۔ صبر کا صلہ بہشت ہے.
۹۔ صابرین کو دشمنوں کا فریب نقصان نہیں پہنچا سکتا.
۱۰۔ صبر کے ساتھ غیبی امداد ملتی ہے.
۱۱۔ صبر پختہ چیزوں اور اہم کاموں میں سے ہے.
۱۲۔ صبر اور نماز مؤمنین کی مدد کر سکتے ہیں.
۱۳۔ صابرین کا اجر بے حد بے شمار ہے.
۱۴۔ خدا صابرین کے ساتھ ہے.
۱۵۔ خدا صابرین سے محبت کرتا ہے
۱۶۔ ایک سو صبر آزما مجاہدین دو سو دشمنوں پر غالب آتے ہیں.

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ.
(۳۰ : ۶۰)

"صبر سے کام لو یہ تحقیق خدا کا وعدہ برحق ہے بے عقیدہ اور بے مقصد لوگ تمہیں ہدف کی پیروی میں سست نہ کرنے پائیں ایسا نہ ہو کہ تم پر ضعفِ نفس چھا جائے اور اس طرح راہِ حق سے بھٹک جاؤ اور منحرف ہو جاؤ۔"

دوسری آیۂ کریمہ میں ہم یوں پڑھتے ہیں:

ہم تمہیں خوف، بھوک، مالی و جانی نقصان اور پھلوں کی آزمائش میں ڈال دیں گے ان صابرین پہ خدا کی رحمت اور درود ہو جو مصیبت کے موقع پہ (اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر کے) انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

اگر ہم یہ ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ خدا کی طرف سے آئے ہیں اور اسی طرف ہماری برگشت ہے تو ہماری اس عظیم روح کے لئے دنیا کی یہ مصیبتیں معمولی ہوں گی اور ان کا اثر ہمارے نفس پہ کم ہو گا۔

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ. (۳ : ۲۰۰)

اے صاحبانِ ایمان صبر، مصابرہ اور رابطہ نگہبانی اختیار کرو۔

بعض علماء کرام نے اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں فرمایا ہے:

صبر کا تعلق انفرادی اخلاقیات سے ہے اور "مصابرہ" ان مصائب کے مقابلے میں ہوتا ہے جو انسان کو زندگی میں دوسروں سے پہنچتے ہیں۔

راغب نے لکھا ہے:

اصبروا انفسکم علی العبادۃ وجاھدوا اھوائکم

اپنے نفسوں کو عبادت کے سلسلے میں صبر کی تلقین کرو (صبر پر آمادہ کرو) اور خواہشات نفسانی کا مقابلہ کرو۔

رابطہ کے معنی مراقبہ اور محافظہ کے ہیں۔ محافظت کے مصادیق میں سے ایک اسلامی سرحدوں کی حفاظت ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا۔ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا۔ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ۔ (۷۰ : ۱۹-۲۲)

"انسان نہایت حریص، لالچی پیدا کیا گیا ہے جب اسے کوئی دُکھ درد پہنچے تو فوراً بے تاب ہو جاتا ہے اور جب اسے کوئی نعمت مل جائے تو اپنے کو بلند مقام پر فائز تصوّر کرتا ہے (یا نیکی سے روکتا ہے) مگر وہ لوگ جو نماز گزار ہیں، ایسا نہیں کرتے۔"

مؤمن کی استقامت اور ثابت قدمی ایسی ہونی چاہیئے کہ مصیبت کے موقع پر نہ گھبرائے اور نعمت اور آسودگی کے موقع پر طغیان اور سرکشی نہ کرے۔

صبر کا معنی

راغب نے "مفردات القرآن" میں صبر کا جو معنی لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

الصبر الامساك فی ضیق، یعنی سختیوں اور تنگیوں میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا۔ جیسے حیوان کو چارہ وغیرہ سے روکے رکھا جاتا ہے، صبر عقل اور شرع کے تقاضوں کے مطابق نفس کو روکے رکھنے، اس پر کنٹرول کرنے کا نام ہے۔ صبر ایک عام مفہوم ہے جس کے مصادیق مختلف ہیں۔

اگر مصیبت کے موقعہ پر نفس کو روکا جائے اور اسے لگام دی جائے تو وہ صبر ہی کہلائے گا اس کی ضد بیتابی ہوگی اور اگر یہی ضبط و تحمل، نفس پر کنٹرول جنگ کے موقع پر ہو تو وہ شجاعت کہلاتا ہے اس کے متضاد جبن اور بزدلی ہے۔

تھکا دینے والی مصیبت پر تحمل کا نام فراخ دلی اور حوصلہ ہے اس کے متضاد "ضجر" یعنی اکتا جانا ہے

کلام کو روکنے اور اسے راز میں رکھنے کا نام "کتمان" ہے اس کے متضاد "اذاعہ" اور افشاء ہے۔

ان سب کا نام خدا نے صبر رکھا ہے۔ اگر صبر کسی چیز کے حصول میں ہو تو یہ پائیداری اور انتظار کہلاتا ہے اس کے مقابلے میں عجلت اور جلد بازی ہے اگر کسی حق کے حصول میں ہو تو اسے کو عفو کہتے ہیں اس کا متضاد انتقام و تقاص ہے۔

صبر کے مصادیق میں سے ایک نعمت اور آسائش کے مقابلے میں صبر ہے۔ بایں معنیٰ کہ نعمت سے استفادہ، اسراف اور فضول خرچی کی حد تک نہ پہنچے۔ مسئولیت اور ذمہ داریاں فراموش نہ ہوں۔ طاقت اور قدرت کے مقابلے میں بھی صبر ہوا کرتا ہے تاکہ طغیانی اور تجاوز کی حد تک نہ پہنچے جو اکثر اوقات انسان کو فاسد کر دیتا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی۔ (۹۶: ۶-۷)

"انسان جب اپنے آپ کو کچھ مستغنی اور بے نیاز محسوس کرتا ہے تو طغیانی پر تُل جاتا ہے۔"

امام باقر علیہ السلام صحیحہ ابی عبیدہ میں فرماتے ہیں:

"مومن وہی ہو سکتا ہے جو اگر (اپنی زندگی پر) راضی ہو تو اس کی یہ رضا اسے گناہ اور باطل میں نہ ڈال دے۔ اگر غضبناک ہو تو اس کا یہ غضب اسے حق گوئی سے نہ روکے اور اس کی قدرت و طاقت تجاوز اور دست درازی تک نہ پہنچے"[1]

خواجہ نصیر الدین طوسی نے فرمایا ہے:

"صبر نفس کو ناپسند، مکروہ چیزوں کے مقابلے میں بے تابی اور گھبراہٹ سے روکنے کا نام ہے، صبر انسانی باطن کو اضطراب، پریشانی، زبان کو شکایت اور اعضاء کو غیر معمولی حرکات سے روکے رکھتا ہے"

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ بے تابی، بلند آواز سے رونے، اپنے منہ پر طمانچے مارنے، گریبان چاک کرنے اور دلتنگی اور بوریت کا نام ہے لیکن صرف رونا صبر کے منافی نہیں ہے۔

چند معتبر روایات[2]

۱۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "صبر کو ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو بدن سے ہے اگر سر نہ رہے تو بدن بے کار ہو جاتا ہے اسی طرح اگر صبر چلا جائے تو ایمان بھی جاتا رہتا ہے۔

---

[1] اصول کافی ج ۳، ص ۳۴۲ پر صحیحہ صفوان بھی تقریباً اسی مضمون کا ہے۔

[2] کافی کے اس باب میں ۲۵ روایات ص ۱۴۲ ج ۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔ بحار میں ۶۵ روایات ہیں جو صبر سیر بعد العسر کے باب میں ہیں۔ ص ۵۶، ج ۷۱۔

یہ مضمون مکرر روایات میں آیا ہے اس سے صبر کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "جو مؤمن بھی کسی آزمائش میں مبتلا ہو اور وہ اس پر صبر کرے اس کا اجر ہزار شہیدوں کے برابر ہے۔"[1]

۳۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: الجنة محفوفة بالمکارہ والصبر فمن صبر علی المکارہ فی الدنیا دخل الجنة و جهنم محفوفة باللذات والشهوات فمن اعطی نفسه لذتها و شهوتها دخل النار۔[1]

بہشت صبر اور سختیوں سے گھری ہوئی ہے، پس جو شخص دنیا میں سختیوں پر صبر کرے وہ جنت میں داخل ہوگا اور دوزخ حرام لذتوں اور شہوتوں میں لپٹی ہوئی ہے جو شخص لذت و شہوت کا اسیر بنے گا اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔

۴۔ روز قیامت لوگوں کا ایک گروہ بہشت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا ان سے کہا جائے گا تم کون لوگ ہو؟ یہ کہیں گے ہم اہل صبر ہیں، پوچھا جائے گا، تم نے کس بات پر صبر کیا تھا؟ جواب دیں گے ہم نے اطاعت خدا اور معصیت خدا پر صبر کیا ہے۔ خدا فرمائے گا: یہ لوگ سچ کہتے ہیں۔

---

[1] شاید شہید سے مراد وہ شہید ہے جو اچانک۔ اور بغیر کسی صبر کے جاں بحق ہوا ہو۔ یا جزع فزع اور گلہ شکوہ کے بعد شہید ہوا ہو ورنہ شہید تو مرتے دم تک صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۷۸ ملاحظہ فرمائیں۔

کہا جائے گا انہیں جنت میں جانے کی اجازت دے دو۔ قولِ الٰہی ہے اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (۳۹ : ۱۰)

"جو صبر کرنے والے ہیں ان کو بے شمار ثواب ملے گا"

آزادی اور مردِ آزاد کے بارے میں آخری روایت :

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

"آزاد آدمی ہر حالت میں آزاد ہے اگر کسی مشکل میں گرفتار ہو تو صبر کرتا ہے۔ اس کے سر پر مصیبتوں کے پہاڑ بھی ٹوٹ پڑیں تو تب بھی اس کے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں آسکتی۔ چنانچہ یوسف صدیق علیہ السلام کی آزادی کو ان کی غلامی نقصان نہ پہنچا سکی۔ یعنی آپ کو شکست بھی ہوئی اور قیدی بھی بنائے گئے مگر قید و بند کی تاریکیاں، کنوئیں کی وحشت اور ان پر نازل شدہ دیگر مصائب انہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، یہاں تک کہ خداوند عالم نے ان پر احسان فرمایا اور اس ظالم و سرکش بادشاہ کو حضرت کا غلام بنا دیا جبکہ پہلے وہ آنحضرت کا مالک اور آقا تھا۔ خدا نے آپ کو رسول بنا کے بھیجا اور ایک امت کو آپکی خاطر موردِ رحمت قرار دیا۔ صبر کا انجام اتنا بخیر ہوا کرتا ہے۔ فاصبروا ووطنوا انفسکم علی الصبر توجروا یعنی، صبر کرو اپنے نفسوں کو صبر کا عادی بنا لو تمہیں اس کا اجر دیا جائے گا۔"[1]

---

[1] مؤمن اکثر سخت مصائب میں مبتلا رہتا ہے۔ اصول کافی ج ۳، ص ۳۵۱

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن وسنّت میں صبر کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور اس کا بیشمار اجر ہے لیکن اس نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ صبر کا مطلب، اجتماعی اور طبیعی آفتوں اور مصیبتوں کے مقابلے جزع سے نفس کو روکنا ہے صبر کا مطلب یہ نہیں کہ ان مصیبتوں کے سد باب اور ازالہ کی کوشش بھی ترک کردی جائے یہ (ازالہ کی کوشش) تو اچھا کام ہے البتہ یہ صبر کے ذیل میں آتا ہے کہ آفتوں کو دیکھ کر متحیر و مضطرب نہ ہوا جائے اور نہ دوسروں کے سامنے ان مصائب کی شکایت کی جائے. بنا برایں اس معنی میں صبر ایک قسم کی استقامت، وقار اور حفظ عزت وآبرو ہے.

صبر بایں معنی کہ ترک واجبات سے نفس کو روکا جائے انجام وظیفہ میں ایک قسم کی استقامت ہے معصیتوں اور ناجائز لذتوں اور شہوتوں سے نفس کو روکنا، تب صبر کہلاتا ہے جب انسان ان کے ارتکاب پر قادر ہو. یہ کام مشکل تو ہے لیکن فضیلت رکھتا ہے.

یہ حقیقت ہے کہ اس مصیبت پر صبر کرنا جس سے مفر نہ ہو اور اس لذت وشہوت سے نفس کو روکنے میں جو انسان کی قدرت میں ہو بہت فرق ہے.

جہاں اقدام ضروری اور بہتر ہو وہاں صبر کرنا سستی اور غفلت شمار ہوتا ہے، جو مومن کے شایان شان نہیں.

موجیم کہ آسودگی ما عدم است
ما زندہ از آنیم کہ آرام نہ گیریم

(ترجمہ) ہم سمندر کی وہ موجیں ہیں جن کا سکون اور آرام ان کی موت

اور عدم کے مترادف ہے ہماری زندگی کا راز اس میں مضمر ہے کہ ہم چین سے نہ بیٹھیں۔"

گناہوں کے زوال میں بیماری کا اثر

مصائب اور دکھ درد، گناہوں کی مغفرت اور عذاب آخرت میں کمی یا زوال کا باعث بنتے ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مصائب ایک قسم کی نعمت ہیں اس مطلب پر کچھ روایات بھی دلالت کرتی ہیں:

ابان نے سند صحیح میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے:

ان المؤمن لیھول علیہ فی نومہ فیغفر لہ ذنوبہ وانہ لیمتھن فی بدنہ فیغفر لہ ذنوبہ"۔[1]

یعنی، "ڈراونے خوابوں، جسمانی آزمائشوں اور تکالیف سے بھی انسان کے گناہ بخشے جاتے ہیں۔"

ایک اور صحیح روایت میں پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں۔

"خداوند عالم فرماتا ہے جس بندے کو بھی جنت میں داخل کرنا چاہتا ہوں اسے کسی جسمانی آزمائش میں ڈال دیتا ہوں اگر اس (جسمانی) مصیبت سے اس کے گناہ نہ بخشے جائیں تو موت یعنی احتضار (جان کنی) کے وقت اس پر سختی کرتا ہوں تاکہ وہ میرے دربار میں بالکل نکھر کر پیش ہو اور اسے جنت میں داخل کروں۔"[2]

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۱۸۱۔

[2] " " ص ۱۸۲۔

بعض اور روایات بحث سے مناسبت رکھتی تھیں جنہیں تسلیم کی بحث میں بیان کر دیا گیا ہے۔

قابلِ توجہ مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے اور اسلامی ممالک کو اہلِ کتاب امریکیوں، مغربیوں، صہیونیوں غرض یہودیوں اور مشرکین (ظاہر ہے کمیونسٹ مشرکین سے زیادہ خبیث و موذی ہیں) نے ناقابلِ بیان اذیتیں دی ہیں، جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور اسلامی تواریخ ان دردناک داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔

قرآن مجید نے شروع ہی سے اس موضوع کی پیش گوئی کی ہے اور مسلمانوں کو خبردار کیا ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذًى كَثِيْرًا۔ (۳ : ۱۸۶)

یقیناً تم لوگ مالی اور جانی آزمائشوں میں ڈال دیئے جاؤ گے اور اہلِ کتاب (یہودی) اور مشرکین سے اذیت ناک باتیں سنو گے۔[1]

---

[1] ممکن ہے آیہ کریمہ سے مراد صرف زبانی اذیتیں ہوں جس طرح تکذیب، گالی گلوچ، تہمت، افتراء اور غلط پروپیگنڈہ میں اور اذیتِ بدنی مراد نہ ہو، کیونکہ آیہ کریمہ میں کہا گیا ہے تم اذیتیں سنو گے یہ نہیں کہا گیا تم اذیتیں برداشت کرو گے اس سے پہلے کی دو آیتوں میں بھی تکذیب کی بحث ہے۔

یہودیوں اور کمیونسٹوں کی طرف سے مسلمانوں کو اذیتیں ضرور پہنچی ہیں لیکن یہ ایسی طاقت فرسا نہیں کہ ان کے مقابلے میں اپنی شکست اور ذلت کا اعتراف کریں اور ہتھیار ڈالیں اور اپنی دنیوی اور اخروی بدبختی تسلیم کر لیں، بلکہ ان اذیتوں کا دو طریقوں سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے گزشتہ جملے کے بعد ان چیزوں کو بیان کیا ہے:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔

(آلِ عمران : ۱۸۶)

ہاں اگر تم صبر، ثابت قدمی اور دین کا دامن نہ چھوڑو تو اپنے آپ کو اس شکست سے بچا سکتے ہو۔

شاید اس صبر اور تقویٰ سے مراد انفرادی صبر اور تقویٰ نہ ہو بلکہ اجتماعی صبر اور تقویٰ مراد ہوں۔ یعنی ان اسلام دشمن طاقتوں کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں اور اپنی دینی ذمہ داریاں کما حقہ نبھائیں۔

اس بحث کے آخر میں قارئینِ محترم کو دو اور نکتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

۱۔ متوسط درجے کا ایمان اور ان آیات اور روایات کے بارے میں متوسط معلومات جن میں صبر اور دنیا کی بے وفائی کا ذکر ہے مؤمن کو صبر پر آمادہ کر سکتے ہیں اور اگر کوئی شخص یقین کی حد تک پہنچا ہو تو اس کا صبر بھی اعلیٰ درجے پر ہوگا۔

۲۔ صبر، اخلاق کی تینوں قسموں سے مناسبت رکھتا ہے جن پر یہ کتاب مشتمل ہے کیونکہ خدا اور مخلوق کے مقابلے میں اور انفرادی، تینوں میں

صبر کی ضرورت ہے، صبر کے علاوہ کچھ اور اوصاف کی بھی تینوں میدانوں میں احتیاج ہے۔

۱۱۔ عفت پاکدامنی

صفاتِ مؤمن میں سے ایک صفت عفت و پاکدامنی ہے۔ ہماری روایات میں عفت سے مراد شرمگاہ اور پیٹ کو حرام شہوتوں سے بچانا ہے یعنی انسان حرام خور ہو نہ اس کا دامن داغدار رہے۔

زرارہ کی صحیح روایت میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں: شکم اور شرمگاہ کی عفت سے بڑھ کر کسی اور عمل کے ذریعے خدا کی عبادت نہیں کی گئی۔[۲]

بعض دانشمندوں نے عفت کی تعریف میں فرمایا ہے:

کھانے اور نکاح (ہمبستری) میں حد اعتدال اختیار کرنے میں عقل کی پیروی کا نام عفت ہے ان دونوں (کھانا اور نکاح) میں انتہا پسندی کو "شرہ" کہتے ہیں جو شہوتِ شکم و فرج (شرمگاہ) اور کھانے اور جماع کے زیادہ حریص ہونے کا نام ہے۔

چنانچہ ان دونوں کاموں میں تفریط (اعتدال سے کمی) کو "خمود" کہتے ہیں

---

[۱] قاموس میں ہے: عفاف کے معنی ایسی چیز سے بچنا جو حلال حسن نہ ہو۔ راغب نے کہا ہے عفت کا مطلب یہ ہے نفس کے لئے ایسی حالت حاصل ہو جس کی بدولت شہوت کے غلبہ سے بچا جائے۔ عفت لغت کے اعتبار سے باقی ماندہ چیز پر اکتفا کرنے کو کہتے ہیں۔ علامہ مجلسی نے بحار میں فرمایا ہے: ←

ممکن ہے آیۂ کریمہ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔" کا اطلاق بسیار خوری پر ہو اور ممکن ہے نہ ہو۔ کیونکہ اسراف تو حرام ہے لیکن بسیار خوری حرام نہیں ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ بسیار خوری اور جماع میں زیادتی جسم وصحت کے لئے نقصان دہ ہے جس کا تعلق علمِ طب سے ہے حتیٰ کہ ابو علی سینا کہتا ہے:

"طب کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہمبستری نہ کرو اور دن میں ایک ہی مرتبہ غذا کھایا کرو اور کھایا ہوا کھانا ہضم ہونے سے پہلے دوبارہ مت کھاؤ"

اگرچہ وہ خود اس دستور اور قانون پر عمل نہیں کرتا تھا، بہر حال کھانے اور جماع کا زیادہ شوق اور حرص، حیاتِ دنیا پست زندگی اور چوپایوں کی صفات میں سے ہے جس کی مذمت کی گئی ہے بلکہ بسیار خوری بھی شرعی نقطۂ نگاہ سے مذموم ہے۔ ابو بصیر کی موثقہ میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:[1]

"شکم، کھانے سے بغاوت کرتا ہے انسان ہلکے پیٹ کے ساتھ خدا کی قربت حاصل کر سکتا ہے، سیر شکم خدا کے نزدیک مبغوض ہوتا ہے۔"

→ روایات میں عفت کا اطلاق شکم اور شرمگاہ کو ناجائز خواہشات سے بچانے پر ہوتا ہے، بلکہ مشتبہ مشکوک مشروبات، ماکولات اور منکوحات حتیٰ ان کے مقدمات و خواہش سے بھی بچنا چاہیئے جس طرح مال حرام کا کسب، بوسے لینا، ہاتھ لگانا اور حرام نظر سے دیکھنا ہے۔ [2] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۲۵ - ۱۲۶۔

[1] الوسائل، ج ۱۶، ص ۴۹۷، اس موضوع پر روایات تو بہت ہیں لیکن اسناد ضعیف ہیں

۱۲۔ برائی سے زبان کو بچانا

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو خصوصاً ایامِ جوانی میں اپنے شکم و شرمگاہ اور زبان کی طرف توجہ دینا چاہیئے کیونکہ یہ چیزیں ہر لمحے کسی نہ کسی خیر یا شر کی جڑ بن سکتی ہیں۔ خدا اور اسلام کا اقرار، ذکرِ خدا، مناجات، استغفار، مؤمنین میں صلح کرانا، والدین کا احترام شعائر کی تعظیم، احکامِ شرع (فقہی، اخلاقی اور اعتقادی) کی تعلیم، تبلیغ، امر بالمعروف نہی عن المنکر، علوم کی تدریس، حاجت مند لوگوں کی رہنمائی، مؤمنین کو خوش رکھنا اور اس قسم کے دیگر نیک اعمال زبان سے انجام پاتے ہیں۔

کفر، فساد برپا کرنا، لوگوں کی توہین، راز فاش کرنا، آبرو ریزی، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، اذیت دینا، گمراہ کرنا، فحاشی اور برائیوں کو رواج دینا، برائی کا حکم دینا، نیکی سے روکنا، الزام لگانا، خیانت کرنا، باتونی ہونا، بدکاری کی تہمت لگانا، اور اس قسم کی دوسری برائیوں کی جڑ بھی زبان قرار پاتی ہے۔ اور زبان کے نقصانات بہت زیادہ ہیں[1]۔

۔حدیث ذیل کی سند اگر صحیح نہ ہو تو بھی اس کا متن بعید از اعتبار نہیں:

من وقی شر ذبذبہ و قبقبہ ولقلقہ فقط وقی الشر کلہ

یعنی، جو شخص اپنے آپ کو شرمگاہ، شکم اور زبان کے شر سے محفوظ رکھے تو

---

[1] زبان کے اہم نقصانات کا تعلق اجتماعی اخلاقیات سے ہے انفرادی اخلاق سے نہیں لیکن عفت کی مناسبت سے یہاں اس پر بحث کی گئی۔

گویا اس کو تمام شرور سے نجات مل گئی ہے۔"

امام سجادؑ صحیح روایت میں فرماتے ہیں:

انسان کی زبان ہر روز صبح باقی اعضاء جسمانی کی خیریت دریافت کرتی ہے، اعضاء جواب دیتے ہیں ہم بخریت ہیں اگر تو ہمیں اپنی حالت پہ رہنے دے، خدا را ہمیں نظر انداز نہ کرو زبان کو قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں ثواب اور عقاب تیری وجہ سے ملتے ہیں[1]

صحیحہ سلیمان میں امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام امیر المؤمنین سے روایت بیان کرتے ہیں:

تمام نیکیاں تین خصلتوں میں جمع ہیں۔

۱۔ نظر۔

۲۔ سکوت۔

۳۔ کلام۔

• ہر وہ نظر، جس کے ذریعے عبرت نہ حاصل کی جائے وہ سہو اور اشتباہ ہے

• ہر وہ سکوت، جس میں فکر نہ ہو غفلت ہے • ہر وہ کلام، جس میں ذکر خدا نہ ہو لغو ہے۔

• وہ انسان خوش قسمت ہے جس کی نظر میں عبرت، سکوت میں فکر اور کلام میں ذکر ہے اس کے علاوہ اپنے گناہوں پر گریہ کرے اور لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں[2]

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں۔

---

[1] اصولِ کافی، ج ۳، ص ۱۷۷۔

[2] بحار الانوار، ج ۷۱، ص ۲۷۵۔

"بنی اسرائیل کا کوئی آدمی دس سال سکوت کے بغیر عابد نہیں بن سکتا تھا"۔[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مؤمن کی نجات اس کی زبان کی حفاظت میں مضمر ہے جو شخص اپنی زبان پر کنٹرول کرے خدا اس کے گناہوں کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔"[2]

امام رضا علیہ السلام صیحۂ بزنطی میں فرماتے ہیں:

"فقہ کی علامات میں سے ایک علامت حلم اور خاموشی ہے۔ سکوت حکمت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ خاموشی اور سکوت محبت کا پھل دیتے ہیں سکوت ہر خیر کی دلیل ہے۔"[3]

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من خاف الناس لسانہ فھو فی النار[4]

جس شخص کی زبان سے لوگ خوف زدہ ہوں وہ جہنم میں داخل ہوگا"۔

نیز امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من علامات شرک الشیطان الذی لا یشک فیہ ان یکون فحاشا لا یبالی ما قال وما قیل فیہ۔"[5]

"بلاشبہ انعقاد نطفہ میں شرکت شیطان کی علامات میں سے ایک علامت یہ ہے کہ انسان بدزبان اور بدکردار ہو اسے اس

---

[1] بحار، ج ۷۱، ص ۲۸۰۔ [2] بحار، ج ۷۱، ص ۲۸۵ [3] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۴۷ [4]

[5] وسائل، ج ۱۱، ص ۳۲۷

بات کی پرواہ نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اسے کیا کہا جا رہا ہے"۔
ایک اور صحیح روایت میں معصومؑ فرماتے ہیں:
"حیاء ایمان کا جز ہے اور ایمان کا نتیجہ بہشت ہے، بدزبانی، جفا اور خشونت (سختی) کا حصہ ہے اور جفا کا انجام دوزخ ہے۔"[1]
اور قرآن مجید کی تاکید ہے:
"قُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُ الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ. (۱۷ : ۵۳)
میرے بندوں سے کہہ دو وہ بات کریں جو نیک اور اچھی ہو۔
شیطان لوگوں میں غلط اور بری مداخلت کرتا ہے۔ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے: اِذَا سَمِعُوْا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ. (۲۸ : ۵۵)
"مؤمنین جب لغو اور بے ہودہ بات سنتے ہیں، تو کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں"
وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا. (۲ : ۸۳)
"لوگوں کے ساتھ خوش کلام رہو۔"
قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا .... (۳۳ : ۷۰)
"تمہارے اقوال مستحکم ہونے چاہئیں، خدا تمہارے اعمال کی اصلاح اور تمہارے گناہوں کی مغفرت فرمائے گا۔"

۱۳۔ عجب اور خودپسندی

اپنے نیک اعمال پر ناز کرنے اور خودپسندی کو عجب کہتے ہیں، امام کاظم علیہ السلام

---

[1] الوسائل، ج ۱۱، ص ۳۳۰

نے اپنے فرزند ارجمند سے فرمایا:

"میرے عزیز فرزند! کوشش کرو اور خود کو عبادتِ خدا میں تقصیر اور کوتاہی کی حد سے خارج نہ سمجھو اور یہ نہ سمجھو کہ مجھ سے کوتاہی نہیں ہوسکتی کیونکہ خدا کے شایان شان عبادت ناممکن ہے۔"[1]

ابوالحسن علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عجب اور خودپسندی کے کئی درجے ہیں۔ ایک درجہ یہ ہے کہ انسان کو اپنا بُرا کام اچھا لگے اور اس سے خوش ہو۔ یہ سمجھے کہ میں نے اچھا کام انجام دیا ہے۔"[2]

انہی درجوں میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ انسان ایمان لے آئے اور اس سے خدا پر احسان جتلائے۔ حال اینکہ خدا کا احسان انسان پر ہے انسان کا خدا پر نہیں۔

بل اللہ یمن علیکم ان ھدٰکم للایمان۔ (۴۹ : ۱۷)

خدا کا تم پر احسان ہے کہ اس نے ایمان کی راہ دکھائی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام صحیحہ عبدالرحمٰن میں فرماتے ہیں:

"انسان کبھی گناہ کا مرتکب ہوجاتا ہے پھر اس پر پشیمان ہوتا ہے اور کبھی کارِ خیر انجام دیتا ہے، جس پر وہ خوش ہوتا ہے یہاں تک کہ (خوشی کی وجہ سے) احساس ندامت جاتا رہتا ہے جبکہ گناہ پر پشیمان ہونا کارِ خیر پر خوش ہونے

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۱۶۔

[2] اصول کافی، ج ۳، ص ۴۲۷۔

سے بہتر ہے۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ گناہوں سے پشیمانی، توبہ اور خدا کے حضور انکسار ہے جو عجب اور خود پسندی سے بہتر ہے۔ ورنہ کارِ خیر انجام دینے کے بعد ہر قسم کی خوشی مذموم نہیں ہے بلکہ لازمۂ ایمان ہے اور نہ ہی گناہ کرنا اطاعت سے بہتر ہے۔

بہر حال اب تک خود پسندی کے چار درجے معلوم ہوئے ہیں:

۱۔ انسان اپنے بُرے کاموں کو اچھا تصور کرے۔ یہ خود پسندی کا بد ترین درجہ ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے:

"کیا تمہیں ایسے افراد کی خبر نہ دیں جو عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے کام بے نتیجہ ہیں لیکن یہ تصور کرتے ہیں کہ ہم بہت اچھا کام انجام دے رہے ہیں"۔

۲۔ انسان ایمان اور عملِ صالح کے ذریعے خدا پر احسان جتائے جو اس کی حماقت کی علامت ہے، قرآن مجید میں کسی حد تک اس سے نہی کی گئی ہے۔

۳۔ اپنے آپ کو اس بات سے دور تصور کرے کہ خدا کی عبودیت اور بندگی میں اس سے کوتاہی بھی ہو سکتی ہے جبکہ یہ ضروری ہے کہ انسان ہر وقت اپنے آپ کو حقیر اور کوتاہ تصور کرے۔

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ. (۳۲:۵۳)

اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ (بے گناہ) تصور نہ کرو۔

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۴۲۸ ۔ بحار، ج ۷۱، ص ۲۲۸

۴۔ اپنے نیک اعمال پر ناز کرنا۔ لیکن نیک اعمال پر دلی خوشی میں کوئی حرج نہیں بلکہ لازمۂ ایمان ہے اور یہ عمل صالح کے تکرار اور کارِ خیر کی توفیق پر خالق کی شکرگزاری کا راستہ ہموار کرتی ہے۔

خود پسندی، معنوی اور روحانی نقص کے علاوہ اجتماعی نفرت کا باعث بھی بنتی ہے کیونکہ خود پسند انسان جب اپنے ہر کام پر نازاں ہو تو عام لوگوں کے لئے مورد نفرت قرار پاتا ہے اور بہت سے کاموں میں اشتباہ اور غلطی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی اصلاح کی امید بہت کم ہوتی ہے۔

اس بحث کے آخر پر دو احادیث

روایتِ صحیحہ میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

آفۃ الدین الحسد والعجب والفخر۔

حسد، خود پسندی اور فخر دین کے لئے آفت ہیں[1]

بقول مرحوم مجلسی حسد اور خود پسندی دل کے گناہوں میں سے ہیں اور فخر زبان کے گناہوں میں سے۔

۲۔ متعدد روایات میں ہے:

تین صفات باعث ہلاکت ہیں، بخل اور خواہشات نفسانی جن کی پیروی کی جائے اور خود پسندی[2]

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۲۴۸۔

[2] بحار، ج ۷۰، ص ۵ تا ۷۔

تزکیۂ نفس

انسانی خلقت اور بعثتِ انبیاء کا مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ لیکن انسان کو چاہیئے کہ صرف باتوں اور خیال ہی میں تزکیہ (تطہیر نفس) نہ کرے کیونکہ یہ چیز انسان کی گمراہی اور پسماندگی کا باعث ہے اور انسان سیر و سلوک میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"اپنا تزکیہ نہ کرو (ایسا تزکیہ جو خود خواہی اور نادانی کا نتیجہ ہو سکتا ہے) خداوند متقین کو بہتر جانتا ہے۔" (نجم: ۳۲)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ

(۴ : ۴۹)

کیا ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اپنا تزکیہ کرتے ہیں (اور) یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہر عیب سے مبرّا ہیں۔ بلکہ خداوند جس کا چاہے تزکیہ فرماتا ہے۔"

یہ خیال کہ میں پاکیزہ ہوں اور ہر قسم کے نقص او رعیب سے پاک اور دُور ہوں غرور اور حماقت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ لا تکلنی الیٰ نفسی طرفۃ عینٍ ابداً.

پالنے والے مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی کھلی چھٹی نہ دے (مطلق العنان نہ چھوڑ)۔

یوسف صدیق علیہ السّلام جو بڑے امتحانات اور آزمائشوں میں کامیاب ہوئے فرماتے ہیں:

"میں اپنے نفس کو بری نہیں سمجھتا (اسے پاک و پاکیزہ نہیں سمجھتا) مگر یہ کہ خدا کی رحمت شامل حال رہے۔"

۱۴۔ شجاعت

عقلی طور پر شجاعت اچھی صفت سمجھی جاتی ہے جس طرح بزدلی اور تہوّر یعنی بغیر کسی عقلی اور شرعی جواز کے مہلک کاموں کا اقدام کرنا بری صفتیں سمجھی جاتی ہیں اسلامی فقہ میں کچھ ایسے موضوعات (فرائض) ہیں جنہیں بزدل آدمی انجام نہیں دے سکتا۔ فقہ اسلام شجاعت مسلمان کو جو عقلاً ممدوح ہے لازمی گردانتی ہے۔ وہ موضوعات یہ ہیں:

۱۔ جہاد۔ خداوند تعالیٰ کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے:

"کفار کے تعاقب میں سستی نہ کرو اگر تمہیں جنگ سے اذیت ہوتی ہے تو انہیں بھی اذیت ہوتی ہے تم خداوند کریم سے ایسی چیز کے امیدوار ہو جس کے کفار امیدوار نہیں۔"

۲۔ عزّتِ نفس، وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸ : ۶۳)

۳۔ عدالت قائم کرنا۔

۴۔ غیرت۔

۵۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

۶۔ بلند ہمتی۔

۷۔ دشمنوں کے مقابلے میں سخت اور مضبوط ہونا۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (۴۸ : ۲۹)

۸۔ فرائض میں استقامت اور ثابت قدمی۔

۹۔ جنگ میں دشمنوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی حرمت۔

۱۰۔ کافروں سے نہ ڈرنا۔

یہ حقیقت ہے کہ بزدلی اور خوف کا نتیجہ دوسروں کا غلبہ ہے۔ اسلامی سرزمینوں پر کفار کے استفادے کے لئے زمین ہموار کرنا، انسانی شرافت، عزت و استقلال کی بربادی اور آخر کار دنیا و آخرت دونوں میں رسوائی ہے۔

تا ستمکش زیر بار غارت و یغمانہ رفت

کار دزداں ستمگر غارت و یغمانہ شد

ترجمہ: جب تک مظلوم آدمی، غارت اور لوٹ مار کے آگے سر نہ جھکائے چور اور ڈاکو کبھی بھی چوری اور لوٹ کھسوٹ نہیں کر سکتے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ کہیں بعض اوقات کچھ کاموں میں احتیاط اور دُور اندیشی، فیصلوں میں مشورے، بعض مقامات پر ظالم سے چشم پوشی، شور شرابے سے مناسب مقام پر احتراز کرنے کو خوف اور بزدلی نہیں سمجھنا چاہیئے۔

خوف کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ خدا کا خوف۔ یہ بہت حَسن اور نیک ہے۔

۲۔ لوگوں کا خوف جو فرائض اور عبودیت ترک کرنے کا موجب بنے ایسا خوف تقیہ کے مخصوص مقامات کے علاوہ قبیح ہے۔

۳۔ دوسروں سے ڈرنا جس سے کوئی فساد لازم نہ آئے اگر ایسے خوف کا کوئی عقلی جواز نہ ہو تو حتمی طور پر قبیح اور قابلِ مذمت ہے اور اگر کوئی عقلی جواز موجود ہو تو اس کے قبیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ اگرچہ بعض علماء کرام نے ہر قسم کے خوف

کو قبیح قرار دیا ہے۔[1]

۱۵۔ وقار

وقار کی یوں تعریف کی گئی ہے:

گفتار و رفتار کے شروع میں اور اس کے دوران نفس کا اطمینان و سکون وقار کہلاتا ہے۔ جب یہ اطمینان اور سکون ملکہ (نفس میں راسخ صفت و کیفیت) کی حد تک پہنچ جائے تو سکینہ کہلاتا ہے۔ بنا بر این سخت بحرانی حالات میں اعصاب قابو میں نہ رہنا مذموم ہے۔

ایک صحیح روایت میں معصومؑ فرماتے ہیں:

مؤمن کو آٹھ خصلتوں کا حامل ہونا چاہیئے، ان میں سے پہلی خصلت اور صفت یہ ہے "وقوراً عند الہزاھز" لرزہ خیز حوادث کے موقع پر باوقار ہونا چاہیئے۔

وقار کے درجوں میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ انسانی نفس محرکات کے زیرِ اثر آکر راہِ راست اور حقیقت سے دُور نہ ہو۔ ارادے میں نظم و ضبط مستحکم ارادے سے ہو۔

---

[1] ممکن ہے کہ بعض مقامات پر انسان خوف زدہ ہو لیکن اسے بزدل نہ کہا جائے، جس طرح ایک بہادر آدمی اپنے سے زیادہ طاقت ور کے ہاتھوں مارے جانے سے خوفزدہ ہو جائے اور بعض مقامات پر بزدلی صادق آتی ہے خوف صادق نہیں آتا۔ مثلاً ایک آدمی تنہا قبرستان میں جانے سے ڈرتا ہے تو یہ بزدل ہے نہ کہ خوفزدہ۔ کیونکہ یہ جانتے ہوئے کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا پھر بھی وہ ڈرتا ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا. (۵ : ۸)

"کسی بھی قوم سے دشمنی تمہیں عدالت سے انحراف پر آمادہ نہ کردے۔"

مگر مظلوم کا ظالم سے انتقام لینا وقار کے منافی نہیں ہے بلکہ عدالت کی حفاظت ہے۔

اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ... وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ. (۴۲ : ۳۷، ۳۹)

"جب غضبناک ہوتے ہیں تو بخش دیتے ہیں اور جب ان پر کوئی ظلم اور زیادتی کرے تو اس کا انتقام لیتے۔"[1]

برائی کا بدلہ برائی ہی ہے اگر کوئی بخش دے اور صلح کرے تو خدا اس کا اجر دے گا۔ بہرحال باوقار مؤمن وہ ہے جو مصیبت کے موقع پر ذلّت گوارا نہ کرے اور نعمت اور آسودگی کے موقع پر غرور و تکبّر نہ کرے اور دونوں حالتوں نعمت و مصیبت میں عبودیت کی راہ سے منحرف نہ ہو۔ وقار کے درجوں میں سے ایک درجہ یہ ہے کہ انسان زیادہ مذاق اور شوخی نہ کرے اور قہقہے نہ لگائے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مذاق نہ کرو کیونکہ اس سے آبرو ریزی ہوتی ہے۔"

نیز امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

قہقہہ شیطان کی طرف سے ہوا کرتا ہے۔

---

[1] ممکن ہے اس روایت میں انتصار سے مراد مدد کرنا ہو۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ انتقام لینا جائز ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:
"مذاق نہ کرو۔ کیونکہ یہ نورِ ایمان کو ختم کردیتا ہے، مردانگی اور مروت کو کمزور کرتا ہے۔ (وسائل، ج ۸، ص ۴۷۹ تا ۴۸۱)

۱۶۔ حلم اور بردباری

حلم، نفس کے سکون اور سنجیدگی کا نام ہے۔ جس کی وجہ سے انسان غصّہ کی حالت میں بے قابو نہیں ہو جاتا، اور کسی بھی ناخوشگوار واقعے سے فوری طور پر متزلزل نہیں ہوتا۔

قیل انہ ضبط النفس عن هیجان الغضب و منعها من الانفعال عن الواردات المکروهۃ المؤذیۃ۔

"بعض حضرات نے حلم کی تعریف میں فرمایا ہے: نفس کو غضب کی وجہ سے ہیجان میں آنے سے قابو میں رکھا جائے اور ناخوشگوار اور اذیت ناک واقعات میں فرار سے روکا جائے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ایک روایت میں فرماتے ہیں:

ان العلم خلیل المؤمن والحلم وزیرہ والصبر امیر جنودہ و الرفق اخوہ والبر والدہ۔[1]

(یعنی) "علم مؤمن کا دوست، حلم اور بردباری اس کا وزیر، صبر اس کے لشکر کا سردار، نیکی اس کا بھائی ہے۔"

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۲۲۶۔ ص ۸۷ پر عبداللہ سے نہیں اسکے بھائی عبدالملک سے روایت کی ہے ظاہراً یہ صحیح نہیں ہے۔

حناط کی روایت صحیحہ میں امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:
"دینِ مسلمان کے کمال کی علامت یہ ہے کہ ایسا کلام ترک کر دے جس سے اس کا ربط اور واسطہ نہ ہو، گفتگو اور لڑائی جھگڑا کم کرے۔ حلم، صبر اور حسنِ خلق رکھتا ہو"[1]

۱۷۔ غرور نہ کرنا

غرور کا مطلب یہ ہے کہ نفس ایسی چیز سے مطمئن ہو جو طبیعت اور خواہشاتِ نفسانی کے مطابق ہو۔[2] جو لوگ مال و دولت، حسن و جمال، حسب و نسب، منصب، ہر دلعزیزی، علم، فن، اپنے تخصص (مہارت) اولاد، عزت، رشتہ دار اور دیگر متعلقین پر اعتقاد رکھتے ہوں اور انہی چیزوں کو اپنی دائمی نجات اور سعادت کا باعث تصوّر کریں وہ مغرور کہلاتے ہیں۔

اسی طرح وہ لوگ بھی مغرور ہیں جنہوں نے شرعی تکالیف (فرائض) کو پس پشت ڈال دیا ہے اور پھر یہ خیال کرتے ہیں کہ رحمتِ خدا انہیں نجات دے گی اور جس طرح دنیا میں اس مہربان ذات کی فراوان نعمتوں سے بہرہ ور ہیں آخرت میں بھی اپنی تمام جنایات و جرائم کے باوجود رحیم ذات کی رحمت سے مستفید ہوں گے۔

---

[1] اصولِ کافی، ج ۳، ص ۳۳۸۔

[2] مفردات راغب میں ہے "غررت فلانا" یعنی "فلاں سے مجھے اپنے مطلب کی چیز مل گئی" غرۃ کا مطلب ہے بیداری میں غفلت اور غرار کا مطلب ہے نیند اور اونگھ ←

يَا اَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۔ (۸۲ : ۶)

"اے انسان تجھے اپنے ربّ کے بارے میں کس چیز نے مغرور بنا دیا ہے"۔

بعض لوگ اولیاء خدا علیہم السّلام کی محبت کے فریفتہ ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ان حضرات سے محبت بلکہ اس محبت میں غلو ان کی اخروی نجات کا باعث بنے گا اور واجبات بجا لانے یا محرمات ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ بعض حضرات صرف انقلابی ہونے کو کمال اور بلندئ مقام کا باعث سمجھتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ اسے دل میں مسلمانوں کی خونریزی، توہین، افتراء، بہتان اور بے گناہوں کو اذیت دینے کا کوئی خوف ہو۔

بعض حضرات چند کتابیں پڑھ لینے پر خوش ہیں بغیر اس کے کہ معارف اسلامی، فقہی اہم مسائل حتٰی عام موردِ ابتلاء احکام کو سمجھیں۔ ایسے لوگ اخلاقی شرافتوں سے بہت دور ہیں۔ باتیں زیادہ کرتے ہیں اور عمل کم۔ دنیائے اسلام کی اجتماعی ذمہ داریاں نبھانے میں کوتاہی کرتے ہیں،

← کی حالت کی غفلت اور غرور سے مراد مال و دولت، جاہ و مقام، شیطان دنیا اور اس قسم کی چیزیں جن سے انسان میں تبدیلی آجائے، غریزہ یعنی خلق حسن۔

بعض علماء اخلاق کا کہنا ہے کہ غرور دو چیزوں کا مرکب ہے۔

(i) نفس کا یہ اعتقاد و یقین کہ فلاں کام میں میرا فائدہ ہے جب کہ اس میں اس کا فائدہ نہ ہو۔

(ii) انسان غضب و خواہشاتِ نفسانی کی پیروی میں اس کام کے درپے ہو جائے۔

بلکہ اسلام کی بربادی اور اسلامی سرزمین پر ملحدین اور کفار کے حملوں کے مقابلے میں ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے اور چند اذکار (دعائیں) رٹ لینے کی بدولت اپنے آپ کو اولیاء اللہ میں شمار کرتے ہیں اور ایسے حالات میں کہ جب مجاہدین و مدافعین کے خون کی ندیاں بہائی جا رہی ہیں۔ مالِ دنیا کی جمع آوری، حقوق وصول کرنے، گھر خریدنے اور دیگر مادی خواہشات کو پورا کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور اپنی سادہ لوحی کی بنا پر علم و عمل کا دعویٰ کرتے ہیں ایسے لوگوں کی جہالت، کم عقلی اور ناجائز غیر جانبداری ابلیس کے لئے بھی مضحکہ خیز ہے۔

کچھ لوگ عبادات کی بعض اقسام بلکہ کبھی تو خرافاتی عبادات کی وجہ سے مغرور بن جاتے ہیں اور دوسروں کو ذلیل و خوار اور ناچیز سمجھتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بے وقوف آدمی دو رکعت نماز بجالانے کے بعد منتظر رہتا ہے کہ خدا کا دیدار نصیب ہو، خدا اس کا شکریہ ادا کرے۔

خیالات نادان خلوت نشین

زھم بر کند عاقبت کفر و دین

کچھ ایسے دولت مند ہیں جو مستحب کاموں میں کچھ خرچ کر کے پھولے نہیں سماتے، لیکن زکوٰۃ، خمس، جہاد اور دیگر مالی واجبات کی ادائیگی سے کتراتے ہیں حتیٰ کہ حرام خوری کے ننگ سے بھی نہیں شرماتے۔

کچھ لوگ تمام دینی اعمال اور پروگراموں کو تطہیر (کپڑوں اور بدن کو پاک کرنے) میں منحصر سمجھتے ہیں اور شیطانی وسوسوں میں مبتلا ہیں۔ اگر کسی وقت ایک سو محرمات کے بھی مرتکب ہوں تو انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی،

مگر جب تک اپنا ہاتھ دس مرتبہ نہ ڈبولیں طہارت ان کی نظر میں مشکوک رہتی ہے۔ اس قسم کے اعمال اس مشہور ضرب المثل کے مصداق ہیں:

"عبادۃ الجاهل مسخرۃ الشیطان"

"جاہل کی عبادت شیطان کا کھیل ہے"

ہاتھ میں تسبیح اور نظر مال و دولت اور دوسروں کی ناموس پر۔

سبحہ بر کف توبہ برلب دل پر از شوق گناہ

معصیت را خندہ می آید ز استغفار ما

البتہ ایسا بھی نہ ہو کہ غرور سے نجات کی خاطر انسان اپنی شخصیّت (مقام خلیفہ اللٰہی) کو فراموش کر دے، جس سے ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

ایمان بہ خدا کے بعد تکامل کی بنیاد، اعتماد بہ نفس اور انسانی عظمت کا یقین ہے۔

جو لوگ انسان کو شہوت پرست حیوان، سواری اور گاڑی کے پرزے کی حد تک پست سمجھتے ہیں درحقیقت وہ اس کی انسانی حقیقت سلب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسی خیانت ہے جو ہائیڈروجن بم سے بھی کئی گنا زیادہ خطرناک ہے۔

بہر حال ہوشیار مسلمان وہ ہے جو تمام اعتقادی، فقہی اور اخلاقی تکالیف و فرائض کا پابند ہو اور کسی صورت میں بھی جہالت، کوتاہ فکری، پست ہمتی اور حبِ نفس اسے مغرور نہ بنا دے اور ایک کمال پر اکتفا کر کے سینکڑوں کمالات سے خود کو بے نیاز نہ سمجھ بیٹھے۔

غرور کی مذمت میں وارد کچھ آیات ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ (۳۵:۴۵)

"اس عذاب میں تم اس لئے مبتلا کئے گئے ہو کہ تم نے آیاتِ الٰہی کا مذاق اُڑایا اور حیاتِ دنیا نے تمہیں مغرور بنا دیا ہے"

۲۔ "وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ" (۵۷ : ۱۴)

"آرزوؤں نے تمہیں فریب دیا ہے"

۳۔ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا۔ (۶ : ۷۰)

چھوڑیں ان لوگوں کو جنہوں نے دینِ خدا کو مذاق سمجھ رکھا ہے اور حیات دنیا نے انہیں مغرور بنا دیا ہے۔

۴۔ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (حدید : ۱۴)

"شیطان نے تمہیں خدا کے کرم کی وجہ سے دھوکے میں رکھا ہے۔"

۵۔ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۱:۳۳)

"دیکھو زندگانی دنیا تمہیں فریب نہ دینے پائے۔ اور شیطان خدا (کے کرم) کی وجہ سے مغرور نہ بناوے"

۶۔ فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ۔ (۴۰ : ۴)

"شہروں میں کفار کی آمد و رفت اور ان کا آسودہ حال ہونا تمہیں فریب نہ دینے پائے، کیونکہ یہ لوگ آخر کار ذلیل اور خوار ہونگے"

۷۔ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ۔ (۶۷ : ۲۰)

"کفار غرور میں مبتلا ہیں":

۸۔ بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا۔ (۳۵:۴۰)

ظالمین ایک دوسرے سے غرور کا وعدہ کرتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حیات دنیا کی زینتوں سے انسان غرور، ذلت اور تکبر میں مبتلا نہ ہو۔

سر شام شاہ فکر تاراج داشت
سحر گاہ نہ تن سر نہ سر تاج داشت
بیک گردش چرخ نیلو فری
نہ نادر بجا ماند نہ نادر گری

"شام کو تو بادشاہ لوٹ مار کا پروگرام بنا رہا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے دیکھا گیا کہ اس کے بدن پر سر ہے نہ سر پر تاج ہے۔ گردش فلک کی ایک حرکت کے نتیجے میں نہ کوئی نادر (بادشاہ) باقی رہتا ہے اور نہ اس کا حامی و مددگار"۔

انسان کو خبردار رہنا چاہیئے کہ کہیں اس کی ایمانی متانت ختم نہ ہو جائے بلکہ ضروری ہے کہ انسان عبودیت کے صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہے۔

۱۸۔ سخاوت[1]

جہاں مال کو خرچ ہونا چاہیئے وہاں اسے روکے رکھنے (خرچ نہ کرنے) کا نام

---

[1] ایک لحاظ سے سخاوت صفات کی اس قسم میں سے ہے جن کا تعلق انفرادی اخلاق سے ہے اور دوسرے اعتبار سے صفات کی تیسری قسم کے ذیل میں آتی ہے جس کا تعلق اجتماعی اخلاق سے ہے۔

بخل ہے اور اسراف اس خرچ کو کہتے ہیں جہاں عقلاء کے نزدیک خرچ کرنا مناسب نہ ہو۔

بخل اور اسراف کی ان تعریفوں سے سخاوت کی تعریف خود بخود سامنے آجاتی ہے اور وہ یہ ہے: مال کو وہاں خرچ کیا جاتے جہاں اسے خرچ ہونا چاہیئے۔ جیساکہ حدود الشریعہ فی محرماتہا کے جزء اوّل میں مذکور ہے اسراف اور تبذیر محرمات شرعی میں سے ہیں۔ بخل شرعاً اور عقلاً قبیح اور سخاوت حسن اور اچھی سمجھی جاتی ہے جو لوگ بخل برتتے اور دوسروں کو بخل کی ترغیب دلاتے ہیں وہ ان چیزوں کو پوشیدہ رکھتے ہیں جو خدا نے اپنے فضل و کرم سے انہیں دے رکھی ہیں۔ وہ یقیناً کیفر کردار تک پہنچ جائیں گے۔

وَاَعْتَدْنَا لِلْکَافِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا۔ (نساء: ۳۷)

"جو لوگ خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں بخل کرتے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ بخل میں ان کے لئے کوئی بہتری ہے بلکہ یہ تو شر ہے کیونکہ وہ مال جس میں یہ لوگ بخل اور کنجوسی کرتے ہیں روزِ محشر طوق کی صورت میں ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ زمینوں اور آسمانوں کی میراث اللہ کی ذات کے لئے مخصوص ہے"۔

خبردار! تم وہی لوگ ہو جنہیں راہِ خدا میں انفاق کے لئے کہا جاتا تھا اور تم (میں سے بعض) بخل سے کام لیتے ہیں جو بخل اختیار کرے اس کا نقصان خود اسے ہی پہنچے گا خدا کی ذات بے نیاز اور صرف تم نیازمند اور محتاج ہو۔"[1]
(سورۂ محمد کے آخر پر)

---

[1] احتمال ہے یہ دونوں آیتیں کفار کے بارے میں ہوں اور بخل سے مراد ———— ہے

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا. (اسریٰ : ۲۹)

"بخل کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کو گردنوں سے نہ باندھے رکھو اور نہ کثرت بخشش کی وجہ سے ہاتھ پھیلائے رکھو کیونکہ اس طرح حسرت و ندامت ہوگی اور خود کو ملامت کرتے رہو گے۔"

بنا بر این مسلمان کو نہ تو بخیل ہونا چاہیئے اور نہ اسے اس کثرت سے مال خرچ کرنا چاہیئے کہ وہ خود تہی دست ہو جائے۔

"رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو انفاق کے موقع پر نہ اسراف (فضول خرچ) کرتے ہیں اور نہ زیادہ سخت گیری کرتے ہیں، بلکہ اعتدال کی راہ اپناتے ہیں۔" (۲۵ : ۶۷)

راہِ خدا میں انفاق کی چند شرائط ہیں :

۱۔ جو مال خرچ کرنا چاہیں وہ حلال ہو، اور مال حرام اس کے مالک اصلی کی طرف لوٹا دینا چاہیئے۔ اگر مال کا اصلی مالک معلوم نہ ہو تو فقہی دستور کے مطابق مالک کی طرف سے صدقہ دیا جانا چاہیئے۔ بہرحال مال کو بخشنا بلکہ اس میں ہر قسم کا تصرف اور رد و بدل حرام ہے اور سوائے عذاب و عقاب کے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

۲۔ مال کو مرغوب ہونا چاہیئے۔ ایسا مال نہ ہو کہ جس کی کوئی قدر و

← واجبات فقہی کی ادائیگی میں بخل ہو چنانچہ ایک معتبر روایت میں آیہ دوم کی تفسیر زکوٰۃ سے کی گئی ہے۔

قیمت نہ ہو اور اگر انسان کو ایسا مال دیا جائے تو وہ اسے بادل نخواستہ قبول کرے۔

اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَاكَسَبْتُمْ. (۲ : ۲۶۷)

"اپنی کمائی میں سے وہ مال راہِ خدا میں انفاق کرو جو پاکیزہ ہو اور جسے ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے، خبیث اور ناپاک مال راہِ خدا میں خرچ نہ کرو۔"

احتمال ہے کہ خبیث سے مراد حرام شرعی ہو۔ بے قیمت اور قابلِ نفرت مال مراد نہ ہو۔ اور ہو سکتا ہے اس سے مراد ایسا مال ہو جو شرعاً حرام ہونے کے علاوہ عرفاً (عام لوگوں کے نزدیک) بے قیمت اور قابلِ نفرت ہو۔

۳۔ مالِ مذکور (جو راہِ خدا میں خرچ ہو رہا ہو) مالک کی نظر میں محبوب و مرغوب ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اس مال سے گلو خلاصی کی خاطر انفاق کرنا چاہتا ہو۔ قرآن فرماتا ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ. (۳ : ۹۲)

"اس وقت تک نیکی نہیں پا سکتے جب تک اپنی محبوب اور مرغوب چیز راہِ خدا میں خرچ نہ کرو۔"

۴۔ مال وصول کرنے والے کی عزت اور آبرو محفوظ رہے۔ کیونکہ اس انفاق اور بخشش کا کوئی فائدہ اور اثر نہیں جس میں مال لینے والے پر احسان جتایا جائے اور اس طرح اسے اذیت دی جائے بلکہ اس صدقہ اور بخشش سے تو شیریں زبانی اور عفو بہتر ہے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى. (۲ : ۲۶۳)

"(جس خیرات دینے کے بعد (لینے والے کو) ایذا دی جائے اس سے تو نرم بات کہہ دینی اور درگزر کرنا بہتر ہے۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ.

"ایماندارو، اپنی خیرات کو احسان جتانے اور (سائل کو) ایذاء دینے کی وجہ سے اکارت مت کرو۔

اس سے پہلے کی آیتِ کریمہ میں خدا فرماتا ہے:

"جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ تو کوئی احسان جتاتے ہیں اور نہ مال لینے والے کو اذیت دیتے ہیں ایسے لوگوں کا اجر و ثواب ان کے خدا کے پاس ہے۔"

ایک معتبر روایت میں معصومؑ فرماتے ہیں:

لا یدخل الجنۃ العاق لوالدیہ ومدمن الخمر والمنان بالفعال للخیر اذا عملہ[1]

"والدین سے برا سلوک کرنے والا، شراب کا عادی اور کارِ خیر انجام دینے کے بعد احسان جتانے والا شخص بہشت میں داخل نہیں ہو سکتے۔"

یہ خیال رہے کہ سائل کے ساتھ بداخلاقی نہ ہونے پائے۔

وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ. (۹۳: ۱۰)

اگر انفاق ریا (دکھاوے) کی نیت سے ہو تو وہ باطل ہوگا، جس چیز سے صدقہ کی اہمیت بڑھتی ہے وہ یہ ہے کہ صدقہ خدا وصول کرتا ہے۔

---

[1] وسائل، ج ۶، ص ۳۱۸

اس بحث کے آخر میں یہ جاننا ضروری ہے کہ صدقہ کو پوشیدہ اور مخفی دینا آشکارا دینے سے بہتر ہے۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ. (۲: ۲۷۱)

یعنی، اگر آشکارا صدقہ دو تو اچھا ہے اور مخفی اور چھپا کر دو تو زیادہ بہتر ہے اس طریقے سے تمہارے گناہوں کی پردہ پوشی ہوگی "!

مگر بعض روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ آشکارا اور علی الاعلان دینا چاہیے اور زکوٰۃ کے علاوہ دیگر صدقات مخفی اور چھپا کر دینا چاہئیں [1]

ایثار

اپنی احتیاج اور ضرورت کے باوجود مال و دولت کا انفاق ایثار کہلاتا ہے بالفاظ دیگر دوسروں کو اپنے آپ پر مقدم کرنے کو ایثار کہا جاتا ہے، جو سخاوت کی سب سے اعلیٰ اور عظیم قسم ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. (۵۹: ۹)

"مہاجرین کو جو کچھ دیا گیا ہے اس سے انصار کو کوئی تشویش نہیں ہوتی بلکہ وہ تو مہاجرین کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود بھی نیازمند ہیں اور جو شخص نفس کے بخل سے محفوظ رہے وہ کامیاب ہے"۔

اب اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا صفت ایثار اور انفاق میں زیادتی جس سے نہی کی گئی ہے "وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ" میں منافات نہیں پائی

[1] الوسائل، ج ۶، ص ۲۱۵۔

جاتی؟

اس سوال کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ بخشش سے وہاں روکا گیا ہے جہاں انسان کے پاس ایک مال موجود ہو اور یہ سارے کا سارا ایک آدمی کو دے دے اور خود خالی ہاتھ رہ جائے اور اسی عمل کا عادی ہو جائے، اور ایثار (جس کی ترغیب دی گئی ہے) وہاں کیا جاتا ہے جہاں ایثار کے بعد اپنے اور برادرِ مؤمن کے لئے اتنا مال باقی رہ جائے جو کافی ہو اور اس ایثار کا اثر وقتی ہو۔ البتہ ایثار تب کیا جائے جب اس سے کسی واجب کا ترک ہونا لازم نہ آتا ہو۔

اس سوال کے مزید اطمینان بخش جواب کے لئے زیادہ وقت اور باریک بینی کی جائے۔ واللہ اعلم۔

ایثار کی ایک اور قسم ہے جو انسانیت کی اعلیٰ مظہر ہے اور وہ کسی الٰہی ہدف کے لئے جان کی بازی لگا دینا ہے۔ مسلمان کی فکر و ذکر، قدم و قلم اور مال، اس کے عظیم مقاصد کی تقویت کے لئے صرف ہونا چاہیئے۔

"انّما الحیٰوۃ عقیدۃ وجھاد۔" (امام حسینؑ)

اگر جہاد کی راہ میں مسلمان کی جان کی ضرورت ہو تو اس کی زبان پر احقاقِ حق (حق کو ثابت کرنے) اور ابطال باطل (باطل کو نابود کرنے) کے لئے یہ نعرہ ہونا چاہیئے:

ای دوست اگر جان طلبی جان بتو بخشم
از جان چہ عزیز است بگو آن بتو بخشم

"دوست! اگر کہو تو جان بھی نثار کردوں بلکہ جان سے زیادہ بھی کوئی چیز پیاری

ہو تو اس کو بھی نثار کر دوں"۔

جادو بانفسھم دون سیدھم

والبذل بالنفس غایۃ الجود

انہوں نے اپنے مولا کی حمایت میں جان کی بازی لگا کر سخاوت کا مظاہرہ کیا اور سخاوت کی آخری منزل یہی ہے کہ انسان اپنی جان نچھاور کر دے۔ جب بھی ایثار کی اس منزل (جاں بازی) تک پہنچیں۔ سمجھ لیں کہ ہم ولی اللہ بن گئے ہیں۔

فائدہ: امام جعفر صادق علیہ السلام صحیحہ حلبی میں فرماتے ہیں:

"حسن ابن علیؑ نے اپنا مال تین مرتبہ راہِ خدا میں تقسیم فرمایا یہاں تک کہ ایک جوتا بھی راہِ خدا میں دے دیا اور ۲۰ مرتبہ پا برہنہ مکہ گئے اور حج کیا"۔[1]

مطالب ذیل قابلِ توجہ اور دقت طلب ہیں:

۱۔ بعض علماء اخلاق لکھتے ہیں:

واجب یا مستحب انفاق (راہِ خدا میں خرچ کرنے) کا راز تین چیزیں ہیں:

(ا) مال کی محبت انسان کے دل سے خارج ہو، اور محبت صرف خدا سے ہو۔

(ب) نفس کو بخل اور کنجوسی کی صفتِ رذیلہ سے پاک کیا جائے۔

(ج) خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے۔ کیونکہ انفاق ایک قسم

---

[1] الوسائل، ج ۶، ص ۲۳۶۔

کا شکر الٰہی ہے۔

راقم کہتا ہے:

انفاق کا اہم فائدہ فقراء کی مدد، بیچاروں اور ناداروں کی دلجوئی اور ان کے دُکھ درد میں تخفیف اور کمی کرنا ہے۔

قرآن مجید اور سنّت پیغمبر (ص) میں انفاق کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ انفاق کی بعض قسموں کو واجب اور بعض کو مستحب قرار دیا گیا ہے۔ یہ سب تاکید اس لئے کی گئی ہے کہ دولتمندوں اور ناداروں کے درمیان طبقاتی "فاصلہ زیادہ نہ ہونے پائے جس سے ان دونوں کے درمیان خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔ اسطرح ضعیف اور کمزور طبقہ کے لئے بھی متوسط قسم کی زندگی میسر آسکے گی۔

جس معاشرہ میں دولتمندوں اور تہی دستوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہو، ضعیف طبقہ اپنی اکثر اقتصادی ضروریات سے محروم ہو اور اس کے برعکس دولتمند طبقہ تمام مادی سہولتوں سے بہرہ مند ہو حتیٰ کہ وہ ریاکاری میں اپنی عزّت بھی داؤ پر لگا دے تو یقیناً دونوں طبقوں کی اخلاقی صفات تبدیل ہو جائیں گی ایک طبقہ تو متکبّر، جابر، خودپسند، خودخواہ، حریص، لالچی، عیاش، جارح، استعمار، ذخیرہ اندوز اور درندہ صفت ثابت ہوگا جبکہ اس کے مقابلے میں دوسرا طبقہ نادار، ذلیل وخوار، پریشان حال، تندمزاج، بدبین، بدظن، ضعیف النفس اور کینہ پرور ثابت ہوگا، ایسے حالات میں ایک مصالحت آمیز زندگی اور امن عامہ کا تحفظ ناممکن ہو جائے گا اور ثروتمندوں کا افراط ناداروں کے لئے تفریط کا تحفہ پیش کریگا۔ اگر حالات اور ماحول بھی اس کے متقاضی ہوں تو نتیجہ معاشرے کی بدبختی کی صورت میں ظاہر ہوگا اور یہ بدبختی اب بھی کمیونزم کے

نام سے کینسر کی طرح انسانیت کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہے جو دنیا پرستی اور بے قید و بند سرمایہ داری کی پیداوار ہے۔

کمیونزم نے اگرچہ بڑے بڑے سرمایہ داروں اور دنیا پرستوں کو ختم کیا ہے لیکن معاشرہ کے تمام مزدوروں اور محتاجوں کو پہلے سے زیادہ بدبخت بنا دیا ہے جس کے نتیجے میں قوم و ملت کا ہر فرد غیر ارادی طور پر ہیئت حاکمہ نامی ایک غنڈہ اور ڈکٹیٹر ٹولے کا حلقہ بگوش غلام بن کر رہ گیا ہے اور لوگوں کا دین، عزت و شرف، فکری سکون اور دنیا غرض سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کمیونزم نظام کے پیروکاروں کا نہ دین ہے نہ دنیا۔[1] گویا کمیونزم اس ہلاکت اور فتنے کا واضح مصداق ہے جس کی طرف قرآن مجید یوں اشارہ فرما رہا ہے:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً.

(۸ : ۲۵)

"اس فتنے سے بچے رہو جو صرف ظالموں تک ہی محدود نہیں رہے گا (بلکہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا)"۔

یہ اور بات ہے کہ بے گناہوں کو روز محشر معاوضہ دیا جائے گا:

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ.

(۲ : ۱۹۵)

"راہِ خدا میں انفاق کرو، اور اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت

---

[1] بطور نمونہ ان بیسیوں کتابوں سے کتاب "سیمای زندہ بگوران" اور کتاب "بہ زمامداران شوروی" کو پڑھیں تاکہ معلوم ہو کہ روس کے مظلوم عوام کس زبوں حالی کا شکار ہیں۔

میں نہ ڈالو"

اگر دولت مند شرعی اخلاقیات اور حقوق کے اصولوں کے پابند ہوں۔ فقراء کی معنوی اعتبار سے اخلاقِ اسلامی کے ذریعے اور مادی اعتبار سے واجب اور مستحب حقوق کے ذریعے اس طرح امداد کریں کہ ان کی عزت و آبرو بھی محفوظ رہے تو یقیناً انسانیت اس بڑی بدبختی سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی اقتصاد و اخلاق پر مشتمل عدالت کی تطبیق اور اس کے نفاذ سے ایک ایسا متوسط اور معتدل ماحول وجود میں آسکتا ہے جس سے دونوں (سرمایہ دار اور نادار) طبقے ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے یا کم از کم تہی دست و نادار کی زندگی قابل برداشت ہو جائے گی۔

۲۔ جب انفاق کا اہم اثر معلوم ہو چکا تو مناسب ہے کہ انفاق اور صدقہ کے باقی آثار بھی پیش خدمت کر دیئے جائیں جن کا معتبر روایات میں ذکر ہے۔

(i) انفاق گناہوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔

(ii) انفاق باعثِ برکت ہے۔

(iii) ستر قسم کی بلاؤں اور بدبختیوں کو دور کرتا ہے۔

(iv) بری (حادثاتی) موت سے بچاتا ہے۔

(v) خفیہ طور پر صدقہ دینا غضبِ الٰہی کو ختم کرتا ہے۔

(vi) قرض کی ادائیگی کا سبب بنتا ہے۔

(vii) معاشرے میں عزت و احترام کا موجب بنتا ہے۔

یہ ایسا اثر ہے جو نہ صرف منصوص ہے بلکہ ہم سب اسے عملی طور پر محسوس کرتے ہیں۔

۳۔ معتبر روایات میں معصومؑ فرماتے ہیں:

کلّ معروف صدقة

ہر نیکی (کارِ خیر) صدقہ ہے۔

۴۔ اگر قریبی رشتہ داروں کے علاوہ کسی کو کوئی چیز بخشی جائے تو جب تک وہ چیز موجود ہے وہ اسے واپس لے سکتا ہے لیکن اگر انفاق کے وقت قصدِ قربت کیا ہو یا اس صدقہ کا عوض وصول کیا ہو تو اسے واپس نہیں لے سکتا۔

بہر حال قریبی رشتہ داروں اور واجب النفقہ لوگوں کو صدقہ دینا غیروں کو صدقہ دینے سے بہتر ہے اور جو غیر ثمند و با حیا فقیر دستِ سوال دراز نہیں کرتا وہ دوسروں پر مقدم ہے۔

۵۔ سخاوت، بخل اور انفاق کے موضوع پر آیات و روایات زیادہ ہیں، اس وقت صرف تین روایات بطور تبرک بیان کی جاتی ہیں:

(۱) امام جعفر صادق علیہ السلام صحیحہ حریز میں فرماتے ہیں:

"سخی اور کریم آدمی وہ ہے جو اپنا مال راہِ خدا میں صرف کر دے"۔

(۱۱) موثقہ علی بن عقبہ عن صادق علیہ السلام:

"راوی کہتا ہے میں نے امام (ع) کی خدمت میں عرض کیا: سخاوت کی حد کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: جو کچھ خدا نے تم پر فرض قرار دیا ہے اسے مال سے نکالو اور مناسب جگہ پر خرچ کرو۔"

اس حدیث میں سخاوت کا لازمی اور ضروری درجہ بیان کیا گیا ہے۔

متعدد روایات یہ کہتی ہیں:

بخل تین مہلک چیزوں میں سے ایک ہے:

"شحّ مطاعٌ وهوی متبعٌ و اعجاب المرء بالنفسه"۔

۱۔"بخل و کنجوسی جسے اختیار کیا جائے۔ ۲۔ خواہشاتِ نفسانی کی پیروی۔ ۳۔ خود پسندی"

بحث کے آخر میں اس نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ بہترین انفاق وہ ہے جہاں مال کو دینِ اسلام کے دفاع اور ملحدین و فاسقین کو اسلام سے دُور رکھنے کے لئے خرچ کیا جائے۔ اس کے بعد کا درجہ حکومتِ اسلامی کے تحفظ و پاسبانی میں انفاق کرنا ہے۔

اختتامیہ (ھدف اور وسیلہ)

آیا ہدف اور مقصد، وسیلہ اور ذریعہ کو مباح بنا دیتا ہے؟

بعض حضرات اس سوال کا مثبت جواب دینے سے گھبراتے ہیں بلکہ یہ بات (کہ ہدف، وسیلہ کو مباح قرار دیتا ہے) کمیونسٹ جیسے خونخواروں اور مجرموں کی طرف منسوب کرتے ہیں جو اپنے بعض سیاسی مقاصد کی خاطر کسی بھی جرم اور فساد سے دریغ نہیں کرتے، ہزاروں بے گناہ انسانوں کو تہہ تیغ کر دیتے ہیں اور آخر کار اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے جھوٹ، توہین، ظلم، تخریب کاری، غارتگری، تجاوز اور خونریزی تک سے نہیں گھبراتے۔

اپنی مملکت (افغانستان) میں اس انقلابِ اسلامی کے دوران کچھ

گروپ اور پارٹیاں دیکھنے میں آئی ہیں جن کے ارکان نے مسلمان ہونے کے باوجود کوئی ایسا جرم نہیں ہے جو نہ کیا ہو، بلکہ انہوں نے عملاً و قولاً اپنی تمام تر صلاحیتیں اور مواقع بے گناہوں کو متہم کرنے، مخلصین کی توہین کرنے اور مومنین کے قتلِ عام کے لئے بروئے کار لائے ہیں انہوں نے اصلی دشمن کی طرف کوئی بنیادی توجہ نہیں دی اور اصولِ اخلاق میں سے کسی اصل یا شرعی فرائض کی پابندی کا مظاہرہ نہیں کیا

"اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطَانُ فَاَنْسٰهُمْ ذِکْرَ اللّٰهِ." (۵۸ : ۱۹)

"شیطان ایسے لوگوں پہ مسلط ہو گیا اور خدا کی یاد تک کو بھلا دیا۔"

بہرحال شاید اس دنیا میں کوئی ایسا باہوش آدمی نہ ہو جو ہدف کو پانے کے لئے ہر وسیلہ کو مباح اور جائز سمجھتا ہو اور کوئی بھی عاقل یہ نہیں کہتا کہ کوئی بھی ہدف کسی بھی وسیلہ کا مجوز نہیں بن سکتا کیونکہ قانون علیت کے مطابق ہر ہدف وسیلہ پر موقوف ہوتا ہے اگر ہدف کا حصول ضروری ہو تو اس کے لئے اس کے وسیلہ کا حصول بھی ضروری اور لازمی ہوتا ہے دوسرے الفاظ میں کبھی تو ہدف اور وسیلہ دونوں نیک، یا کم از کم دونوں مفسدہ اور قباحت سے خالی ہوتے ہیں اور کبھی ہدف اور وسیلہ دونوں مفسدہ اور ضرر پر مشتمل ہوتے ہیں یہ دونوں صورتیں ہماری بحث سے خارج ہیں، پہلی صورت ہدف و وسیلہ کو حاصل کرنا اور دوسری صورت میں دونوں کو ترک کرنا لازمی ہے۔ یہ ایک واضح سی بات ہے۔

اگر ہدف مضر اور نقصان دہ ہو اور وسیلہ بے ضرر ہو تو اس صورت میں ہدف کے ضرر کی وجہ سے وسیلہ کا اپنا نقصان دہ ہوتا ہے۔

ہماری بحث اور اختلاف اس صورت میں ہے جب ہدف مصلحت پر مشتمل ہو ان دونوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہدف، وسیلہ کے لئے مجوز بن سکتا ہے یا نہیں؟

آیا کسی مقصد کے حصول کے لئے ہر ممکن وسیلہ کو اپنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہدف اور اس کے وسیلہ کا باہمی موازنہ کیا جائے یعنی ہدف اور وسیلہ کی مصلحت و مفسدہ کو عقلی میزان اور کسوٹی پر پرکھا جائے اگر ہدف میں موجود مصلحت وسیلہ میں موجود مفسدہ سے زیادہ ہے تو ایسا وسیلہ مباح ہو جائے گا ورنہ اگر ہدف کی مصلحت وسیلہ کے مفسدہ سے زیادہ نہ ہو تو ہدف سے دستبردار ہونا چاہیئے۔

شاید اس حکم میں اصل مطلب اور اہل نظر حضرات میں کوئی اختلاف نہ ہو اختلاف اور طویل بحث کی محتاج یہ بات ہے کہ وہ میزان، معیار اور کسوٹی کیا ہے جس پر مصلحت اور مفسدہ پرکھا جائے۔

مختلف ادیان و مکاتب فکر میں سے ایک کے نزدیک ایک خاص اہمیت اور معیار ہوا کرتا ہے جس کی بنیاد پر وسیلہ کے مباح یا حرام ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے اگرچہ بعض گروہ ایسے بھی ہیں جو کسی معیار کو مدِنظر رکھے بغیر وحشیانہ حرکتیں اور اقدامات کرتے ہیں۔

مثلاً کمیونسٹ، سرمائے اور برآمدی ذرائع کو قومیانے اور لوگوں کو پارٹی کا قیدی بنانے کی خاطر لاکھوں انسانوں کے قتل عام کو مباح اور جائز سمجھتے ہیں۔ بدامنی، قحط اور خوف و ہراس پھیلانا اور جھوٹ، تہمت، دھوکہ فریب اور مکاری سے کام لینا تو ان کے لئے معمولی بات ہوتی ہے بلکہ اپنے

پروگراموں کی سہولت کی خاطر ان اخلاقی اصولوں کو ماننے کے لئے بھی یہ تیار نہیں ہیں جن پر پوری انسانیت متفق ہے۔ ان اصولوں کو ماننا یا ان کا احترام کرنا تو درکنار یہ تو ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

مغربی سرمایہ دارانہ نظام (کیپیٹل ازم) نے بھی بے مہار انفرادی آزادی کے تحفظ اور کھلی رقابت کی خاطر تمام اخلاقی اور انسانی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ دونوں گروپوں (کمیونسٹ اور سرمایہ داروں) کی نظر میں انسانی خلقت کا کوئی اعلیٰ مقصد، جس کے حصول کا انسان ذمہ دار ہو، نہیں ہے۔ بلکہ یہ لوگ انسان کو ایک حیوان کامل کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مگر اسلام ان دونوں (کمیونزم اور کیپیٹل ازم) کے بالکل برعکس انسان کو باہدف لافانی اور خلافت ربانی کا حامل سمجھتا ہے یعنی انسان کو تکامل کی غرض سے خلق کیا گیا ہے اور یہ کہ اس پر اجتماعی اور روحانی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اسلام کے پاس مصلحت اور مفسدہ کو پرکھنے اور اس کا موازنہ کرنے کے لئے الگ معیار اور کسوٹی ہے جس کا رابطہ خالص انسانی فطرت سے ہے۔ اسلام پوری انسانیت کی اصل غرض کے تحفظ کی خاطر جہاد کو لازمی اور مباح قرار دیتا ہے اور کمیونزم اور کیپیٹل ازم کے مقاصد کو باطل، انسانی ناموس و آبرو کے منافی سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی معاشرہ جس طرح روٹی، پانی اور سورج کا محتاج ہے اسی طرح ایسے ضوابط اور اصولوں کا بھی محتاج ہے جو سب کے لئے قابل احترام ہوں جن پہ تمام انسانی حرکات و سکنات، مقاصد اور خواہشات منطبق ہوں، جن کی روشنی میں کسی عمل کی اچھائی اور برائی کو پرکھا جا سکے

اور خود غرضی کی تباہ کن آفتوں سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو نجات دی جا سکے۔ اس طرح انسانی روابط اور اجتماعی عدالت کو استحکام حاصل ہوگا۔ اخلاقی معیاروں اور کسوٹیوں میں اختلاف نہ بھی ہو پھر بھی دین کے بغیر صرف علم، اقتصاد اور تربیت، قانون سازی اور معیار و میزان کے تعین کے لئے کافی نہیں بلکہ صرف اور صرف خالص دینِ الٰہی، آسمانی احکام اور ہدایات ہیں جو ہمیں ایسے ضوابط اور اصول دے سکتے ہیں جن کی مخالفت خلوت اور تنہائی میں بھی نہ ہو سکے۔ ان اصولوں کا احترام اور زندگی پر ان کو منطبق کرنے کا تصوّر انسان کے جسم و جان پر چھایا رہے۔ ایسے اصول اور میزان، فرحت بخش انسانی اقدار کی نشاندھی کر سکتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (۶۲ : ۲)

وہی تو ہے جس نے جاہلوں ہی میں سے انہی میں کا ایک رسول (محمدؐ) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتے ہیں۔

اگر تمام انسانوں کے نفسوں پر دینِ خدا کا حکم کارفرما ہوتا تو آج انسانیت اس طرح تنگ اور داغدار نہ ہوتی مثلاً حجاج بن یوسف، یزید، ہٹلر، اسٹالین، فرعون، نمرود، چنگیز خان، برزنیف اور دیگر خون آشام جابر حکام اور مغرب و مشرق کے فاسد سربراہانِ مملکت انسانوں کی تاریخ میں خون کی ندیاں نہ بہاتے۔

ہمیں ایک مرتبہ پھر قرآن کے اس ارشاد کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے:
عصر کی قسم! انسان، جنگلی درندہ سے زیادہ ذلت، بدبختی، انحطاط اور خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لے آئے ہوں اور نیک اعمال انجام دیتے ہوں ایک دوسرے کو حق و صبر اور استقامت کی تلقین کرتے ہوں۔

تیسرا حصہ

انسان
کا
معاشرتی اخلاق

بعض اخلاقی صفات ایسی ہیں جو اجتماعی میل جول اور تعلقات میں ضروری ہوتی ہیں۔ اور ان صفات کے تقاضوں کی پابندی کرنا چاہیئے اور بعض اخلاقی صفات ایسی ہیں جو بعض لوگوں کے ساتھ میل جول اور تعلقات میں ضروری ہوتی ہیں اس لئے اس حصے کی تمام مباحث دو ابواب میں بیان کریں گے۔

باب اوّل: وہ اخلاقی صفات جو اجتماعی روابط کے لئے ضروری ہیں ۔ خوش اخلاقی ۔ صلح پسندی ۔ انصاف ۔ لوگوں سے بے نیازی ۔ غضبناک نہ ہونا ۔ معاف کرنا ۔ نیکی اور احسان کرنا ۔ برائی کا جواب نیکی سے دینا ۔ حسد نہ کرنا ۔ حسد کے اسباب ۔ حسد کا فقہی حکم ۔ تواضع ۔ تکبر سے اجتناب ۔ توجہ طلب نکتہ ۔ لڑائی جھگڑے سے بچنا ۔ صداقت ۔ عدالت ۔ ایک چونکا دینے والی روایت ۔ ظالموں کی طرف رجحان ــــ دوسرا باب: مختلف لوگوں کے ساتھ انسانی اخلاق ۔ مسلمانوں اور مومنین کے ساتھ اخلاق ۔ کفار سے اخلاقی برتاؤ ۔ بدکاروں سے اخلاقی سلوک ۔ قریبی رشتہ داروں سے اخلاقی برتاؤ ۔ ہمسایوں سے اخلاقی روابط ۔ اہلِ علم سے اخلاقی برتاؤ ۔ مرد اور عورت کے درمیان اخلاقی روابط ۔ حکومت اور عوام کے درمیان اخلاقی روابط ۔ اختتامیہ ۔ اخلاقی آیات ۔ بعض اخلاقی روایات ۔ اخلاقی داستانیں ۔ آخری داستان ۔ دعا کے بارے میں ۔ اختتامیہ ۔ دعا کی قسمیں ۔ شرائط دعا ۔ شرائطِ دعا کے بارے میں ایک نکتہ ۔ جن کی دعا قبول یا رد ہوتی ہے ۔ وہ لوگ جن کی دعا قبول ہوتی ہے ۔ دعا قبول نہ ہونے کی وجہ ۔ ایک اور اعتراض ۔ دعا قبول ہونے میں تاخیر ۔ یادِ خدا کا بیان۔

باب اوّل

۵ اخلاقی صفات جو اجتماعی روابط کیلئے ضروری ہیں

کون نہیں جانتا کہ اخلاق کس حد تک صحیح اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے۔ اجتماعی امن وامان اور افراد کے باہمی روابط اخلاقِ حسنہ ہی کے سایہ میں میسر ہو سکتے ہیں. کیا دنیا کے بڑے اور متمدن ممالک میں سرکاری طور پر یہ رپورٹ شائع نہیں ہوئی کہ ہر تیس سیکنڈ میں ایک قتل، عصمت دری اور ڈاکہ عمل میں آتا ہے۔ آخری سالوں میں اس قسم کے دیگر جرائم کی تعداد میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک امریکی رسالہ لکھتا ہے:

۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۱ء تک امریکہ کی آبادی میں پانچ فیصد اضافہ ہوا ہے. توقع کی جا رہی تھی کہ جرائم میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہوگا لیکن ان پانچ سالوں کے دوران جرائم کی تعداد ۴۷٫۲ فی صد بڑھ گئی ہے، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان مقابلہ لرزہ خیز حد تک پہنچ گیا ہے اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے۔

۱۹۶۰ء میں ہر ۵۸ منٹ میں ایک بربریت انجام پاتی تھی جبکہ ۱۹۷۰ء میں صرف ۳۳ منٹ کا وقفہ رہ گیا۔ ۱۹۶۰ء میں ہر ۶ منٹ میں ایک چوری کی جاتی تھی جبکہ ۱۹۷۰ء میں ہر ۹۱ سیکنڈ میں ایک چوری ہونے لگی۔ جبری زنا وغیرہ کی واردات ہر ۳۴ منٹ سے ۱۴ منٹ تک پہنچ گئیں۔

ہمیں چاہیئے کہ معاشرے کی سلامتی کے تحفظ، بہتر باہمی زندگی اور امن عامہ کی بقا کی خاطر اپنے اخلاقی روابط اور تعلقات مستحکم کریں اور موضوعاتِ ذیل کی طرف زیادہ توجہ دیں۔

۱۔ خوش اخلاقی

خوش خلقی پسندیدہ گفتار اور ہشاش بشاش چہرے کا نام ہے اور سوء خلق و بد اخلاقی اس کے برعکس ہے۔ اگرچہ خوش اخلاقی اور بد اخلاقی کا معنی عام لوگوں کے نزدیک واضح اور آشکارا ہے تاہم اس سلسلے میں بعض دینی تاکیدات کی طرف توجہ فرمائیں:

۱۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ (۲:۸۳)

"لوگوں سے ہمیشہ اچھے طریقے سے ہمکلام ہوا کرو۔"

۲۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان صاحب الخلق الحسن لہ مثل اجر الصائم القائم.

"خوش اخلاق کا اجر و ثواب اس شخص کے ثواب کے برابر ہے جو رات نمازیں پڑھتا رہتا ہو اور دن کو روزے رکھتا ہو۔"[1]

۳۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا:

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۵۷، صحیحہ ذریح ابن سنان۔

"اپنے مؤمن بھائی سے ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ ملاقات کرو۔"[1]

۴۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"روزِ محشر تم میں سے سب سے زیادہ میرے نزدیک وہ آدمی ہوگا جس کا اخلاق اچھا ہو اور جو لوگوں کے قریب زیادہ ہو۔"[2]

۵۔ امام جعفر صادق علیہ السلام صحیحہ حناط میں فرماتے ہیں:

"جس شخص میں چار چیزیں ہوں گی وہ کامل الایمان ہوگا اور گناہوں کی کثرت اس کے ایمان کو کم نہیں کر سکتی۔ وہ چار چیزیں یہ ہیں:

i۔ سچ بولنا۔

ii۔ امانت کو اس کے مالک تک پہنچانا۔

iii۔ حیاء

iv۔ حسن خلق۔

۶۔ امام محمد باقر علیہ السلام صحیحہ محمد بن مسلم میں فرماتے ہیں:

اکمل المؤمنین ایماناً احسنھم خلقاً۔

"ایمان کے اعتبار سے سب سے کامل وہ آدمی ہے جو خلق کے اعتبار سے سب سے اچھا ہو۔"

۷۔ امام صادق علیہ السلام صحیحہ سنان میں فرماتے ہیں:

"خوش اخلاقی گناہوں کو اس طرح پگھلا دیتی ہے جس طرح آفتاب برف کو پگھلا دیتا ہے۔"

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۶۱ [2] بحار، ج ۷۱، ص ۳۹۵

۸۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

واجبات عملی کے بعد کوئی اور عمل اس حسن خلق سے زیادہ محبوب خدا نہیں جس کی وجہ سے لوگوں کو اس با اخلاق شخص سے کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔"

۹۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"بہ تحقیق بداخلاقی، عمل کو اس طرح باطل کردیتی ہے جس طرح سرکہ شہد کو خراب کردیتا ہے۔"[1]

قرآن مجید یوں فرما رہا ہے:

لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ. (۳: ۱۵۹)

"اگر آپ سخت مزاج اور سنگ دل ہوں گے تو لوگ آپ کو چھوڑ کر منتشر ہو جائیں گے۔"

آپ نے دیکھا کہ تند مزاج اور سخت دلی کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور ان کا علم بھی بے اثر ہو کر رہ جاتا تھا۔ لیکن مہربانی اور خوش اخلاقی لوگوں کو راہِ خدا کی طرف ہدایت کرنے کا بہترین دلکش ذریعہ ہے۔

علامہ مجلسی فرماتے ہیں:

"خلق ان صفات کا نام ہے جو نفس انسانی میں راسخ ہوں، چاہے وہ صفات اچھی ہوں یا بری! اور حسن خلق اکثر ان صفات کو کہا جاتا ہے جو ایک اچھی سوسائٹی اور لوگوں کے ساتھ بہترین ملنساری

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۵، وج ۴، ص ۱۱۔ بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۲۹۶

کا باعث بنیں"۔

مرحوم مجلسی ایک روایت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"نیک اور اچھے اعمال کی طرح حسنِ خلق کا بھی ثواب ملے گا۔"

بعض اہلِ قلم فرماتے ہیں:

وہ اخلاقیات جو انسان کی مادی زندگی کے لئے لازمی سمجھی جاتی ہوں محاسن اخلاق کہلاتی ہیں اور وہ اخلاقیات جو انسان کی روحانی و معنوی بلندی اور کمال کے لئے ضروری ہوں، مکارم اخلاق کہلاتے ہیں۔

لیکن بعید نہیں کہ ان روایات کا مقصد یہ ہو کہ محاسن اخلاق مکارمِ اخلاق کا ایک حصہ ہیں۔ ان روایات میں حُسنِ خلق سے مراد صرف خوشروئی، ہشاش بشاش رہنا، اچھا معاشرہ اور بہتر رہن سہن ہے۔ بہر حال خوش اخلاقی اور لوگوں سے اچھا برتاؤ، صبر، وقار، درگزر، عفو، چشم پوشی اور تواضع جیسی پسندیدہ صفات اور اخلاقی فضائل پر موقوف ہے۔ وفقنا اللہ لما یحب و یرضی خیر خدا ہمیں ان صفاتِ حمیدہ اور ہر کارِ خیر کی توفیق عنایت فرمائے۔

بحث کے آخر میں اس روایت کی طرف توجہ فرمائیں:

ما ایسر ما رضی الناس بہ منکم کفوا السنتکم عنہم[1]

"وہ چیز کتنی کم ہے جس کے ذریعے لوگ تم سے راضی رہ سکتے ہیں دیکھو اپنی زبان کو بدگوئی (اور دوسروں کے عقائد پر حملے سے) روکو۔"

اس کتاب کی گزشتہ مباحث میں بدگوئی (بد زبانی) کے بارے میں ایک مطلب ذکر کیا گیا۔ بہر حال حسنِ خلق اور خوش مزاجی ایسے موقع پر صحیح نہیں جہاں اس خوش اخلاقی سے مخاطبین کے گنہگار ہونے کا خدشہ ہو

---

[1] الوسائل، ج ۱۱، ص ۴۹۸۔

یا جن کی طرف رجوع نہ ہو۔

۲۔ صلح پسندی

صلح پسندی کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ایذا رسانی کو برداشت کیا جائے اور ان سے سازگار رہا جائے۔ اسے خوش اخلاقی کا ایک پہلو قرار دیا جا سکتا ہے اس عنوان کے ذیل میں مرحوم کلینی نے چھ روایات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک روایت میں رسول اکرم (ص) نے فرمایا :

"خدا نے لوگوں سے صلح پسندی کا اسی طرح حکم دیا ہے جس طرح دوسرے فرائض کا ذکر کیا ہے۔"[1]

لیکن چونکہ ان روایات کی سند علم رجال کے اعتبار سے معتبر نہ تھی اس لئے ان کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔

تاہم ایک صحیح روایت میں پیغمبر (ص) فرماتے ہیں :

الرفق یمنٌ والخرق شؤم.

"نرمی برکت اور تند مزاجی نحوست ہے۔"

۳۔ انصاف

مرحوم کلینی نے انصاف کے بارے میں "کافی" میں بیس روایات ذکر کی ہیں ان میں سے ایک کا، جس کی سند صحیح ہے مضمون یہ ہے :

---

[1] ص ۹۷ ا ح ۳۔ اصول کافی۔

"خداوند عالم کے یہاں ایک بہشت ہے جس میں صرف تین گروہ ہی داخل ہوں گے، ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو اپنے نفس میں حق کا فیصلہ و حکم صادر کرے (اور با انصاف ہو")۔[1]

ایک صحیح روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

ما ناصح اللہ عبد فی نفسہ فاعطی الحق منھا واخذ الحق لھا الا اعطی خصلتین رزقا من اللہ و رضا عن اللہ یغنیہ[2]

"جو شخص حق کو اپنے نفس سے اور اپنے نفس کے لئے حاصل کرے اسے ایسا رزقِ حلال اور رضائے خدا حاصل ہوگی جس سے وہ مستغنی ہو جائے گا"

صحیح روایت میں معصوم (ع) فرماتے ہیں:

ما ابتلی المؤمن بشیٔ اشد علیہ من خصال ثلاث یحرمھا قیل وماھن؟ قال: المواسات فی ذات اللہ والانصاف من نفسہ (فی ذات یدہ) و ذکر اللہ کثیراً....[3]

"مؤمن تین خاصیتوں سے زیادہ سخت کسی آزمائش میں مبتلا نہیں کیا گیا۔

(i) باہمی ہمدردی (ii) انصاف (iii) خدا کو زیادہ سے زیادہ یاد کرنا۔"

---

[1] ص ۲۱۸، ج ۲ اصول کافی۔

[2] وسائل، ص ۲۲۷، ج ۱۱۔

[3] ص ۱۵۱، ج ۹۳ بحار الانوار۔

۴۔ لوگوں سے بے نیازی

روایت صحیحہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مؤمن کا شرف اس کی نماز شب اور عزت لوگوں سے بے نیازی میں ہے۔"[۱]

اس سلسلے میں متعدد روایات منقول ہیں۔ ذیل میں امام صادق علیہ السلام کی ایک جاذب روایت نقل کرتے ہیں جو صحیحہ ابی بصیر میں مذکور ہے:

"انصار کی ایک جماعت پیغمبر اکرم (ص) کی خدمت میں شرف یاب ہوئی اور سلام عرض کیا۔ آپ (ص) نے سلام کا جواب دیا۔ اس جماعت نے عرض کیا: ہم آپ کے پاس ایک حاجت لے کر آئے ہیں۔ آپ (ص) نے فرمایا اپنی حاجت پیش کرو۔ عرض کیا گیا: ہماری حاجت بہت بڑی ہے آپ (ص) نے فرمایا: جیسی بھی ہے پیش کرو۔ انہوں نے کہا: اپنے پروردگار سے بہشت کی ضمانت دلائیں۔ آپ (ص) نے کچھ تامل کے بعد فرمایا: میں یہ کام انجام دوں گا بشرطیکہ تم کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرو۔ ان لوگوں نے پیغمبر اکرم (ص) کے حکم کی یہاں تک تعمیل کی کہ ان میں سے ایک فرد کے ہاتھ سے دوران سفر تازیانہ گر جاتا ہے لیکن اس کا دل نہیں مانا کہ وہ کسی سے تازیانہ اٹھانے

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۲۱۸۔

کے لئے کہے تاکہ وہ اس طرح سوال کرنے سے بچا رہے، چنانچہ اس نے خود سواری سے اتر کر تازیانہ اٹھایا۔ اسی طرح اگر کسی دستر خوان پر ہوتا پانی کے نزدیک بیٹھے ہوئے آدمی سے پانی نہ مانگتا بلکہ خود جا کر پانی پی لیتا تھا۔"[1]

اس قسم کی خواہشات و سوالات سے بدتر لوگوں کے سامنے کسی غرض سے چاپلوسی کرنا ہے، جبکہ اس نے واجب قرار دیا ہے کہ روزانہ دس مرتبہ

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (۱ : ۵)

"تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں" کہیں (تیری ذات کے علاوہ ہر چیز آلہ کار اور ذریعہ ہے، مسبب الاسباب تیری ہی ذات ہے)۔"

صحیحہ حریز میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"... والاستغناء باللہ عزوجلّ عن طلب الحوائج الی صاحب سلطان، انہ من خضع لصاحب سلطان ولمن یخالفہ علی دینہ طلبا لما فی یدیہ من دنیاہ اخملہ اللہ عزو جل مقتہ علیہ و وکلہ الیہ۔"[2]

"طاقت وروں، حکومتی ملازموں اور مذہب دشمن لوگوں کے

---

[1] الوسایل، ج ۶ ص ۳۰۷۔

[2] ص ۱۲۸، ج ۱۲ الوسایل۔

سامنے مالِ دنیا کی خاطر جھکنا غضب الٰہی کا باعث بنتا ہے۔"

لیکن بعض اوقات دین و نفس محترمہ کی حفاظت اور فساد و معصیت کی روک تھام کے لئے سوال کرنا یا مانگنا واجب یا مستحب ہو جاتا ہے، لہٰذا ہوشیار مؤمن کو چاہیئے کہ وہ اپنے اخلاقی اور غیر اخلاقی مسائل میں تمام پہلو مدنظر رکھے تاکہ کسی غیر ضروری اخلاقی پہلو کو حقوقی، (فقہی) پہلو پر مقدم نہ کر دے یا کسی اہم اخلاقی پہلو کو غیر اہم کی خاطر ترک نہ کر دے۔

۵۔ غضبناک نہ ہونا

قرآن کریم میں آیا ہے:

"اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کے حصول میں سرعت سے کام لو جو دکھ اور سکھ دونوں حالتوں میں راہِ خدا میں انفاق کرنے، اپنے غصے کو پی جانے اور لوگوں سے چشم پوشی اور درگزر کرنے والے متقین کے لئے بنائی گئی ہے۔ (۳ : ۳۴)

مرحوم مجلسی نے اپنی کتاب "بحار الانوار" میں غضب کی مذمت میں ۴۳ روایات نقل کی ہیں جن میں سے تین روایات میں یہ جملہ موجود ہے:

الغضب مفتاح کل شر [1]

"غصہ ہر شر کی کنجی ہے۔"

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۲۶۲ تا ۲۸۰۔

امام صادق علیہ السلام صحیحہ ابن سنان میں فرماتے ہیں :

"تین صفات جس شخص میں بھی پائی جائیں، خداوند حورانِ بہشت کو اس کے عقد میں دے دے گا، تین صفات یہ ہیں :

۱۔ غصہ پی جانا،

۲ راہِ خدا میں تلواروں کی ضربتوں پر صبر کرنا، (اسلام کی خاطر میدان میں آنا)

۳۔ مالِ حرام تک رسائی کے باوجود خدا کی خاطر اسے ترک کر دینا۔"

صحیحہ ثمالی میں امام صادق علیہ السلام نے رسولِ خدا (ص) سے روایت کی ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا :

"لوگوں میں سب سے زیادہ درگزر اور چشم پوشی کرنا اسے زیب دیتا ہے جو سب سے زیادہ انتقام پر قادر ہو اور سب سے متحمل انسان وہ ہے جو سب سے زیادہ غصہ پی جائے۔"[1]

البتہ خدا کے لئے اور باطل کے خلاف غضبناک ہونا پسندیدہ اور قابلِ تعریف صفت ہے :

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ ۔ (۴۸ : ۲۹)

"مومنین کفار کے مقابلے میں سخت ہوتے ہیں۔"

وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ ۔ (اے رسول! کفار پر سختی کیجئے)۔(۹ : ۷۳)

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۴۲۱۔

مگر یہ خیال رہے کہ اللہ کے لئے غضبناک ہونا حد سے تجاوز نہ کر جائے، کیونکہ مسلمان کے دوسرے اعمال اور فرائض کی طرح اللہ کی خاطر غضبناک ہونے کی بھی کچھ حدود ہیں۔

رسول اللہ (ص) سپاہِ اسلام کو جہاد پر بھیجتے وقت فرمایا کرتے تھے:

"لا تغلوا ولا تمثلوا ولا تغدروا ولا تقتلوا شیخاً فانیا ولا صبیا ولا امراءۃ ولا تقطعوا شجرۃ الا ان تضطروا الیھا و ایما رجل من ادنی المسلمین او افضلھم نظر الی احد من المشرکین فھو جار حتی یسمع کلام اللہ فان تبعکم فاخوکم فی الدین و ان ابی فابلغوہ مأمنہ واستعینوا باللہ"[1]

"دیکھو جہاد کے موقع پر غلو اور انتہا پسندی کا مظاہرہ نہ کرنا کسی کے ناک، کان ہاتھ اور پاؤں نہ کاٹنا، دھوکہ اور فریب بھی نہ دینا۔ ضعیف بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا، دشمن کے درخت نہ کاٹنا مگر یہ کہ کسی اہم اور اسلامی مفاد کی خاطر درخت کی کٹائی ناگزیر ہو جائے۔ مسلمانوں میں سے چاہے عام اور نچلے طبقے کے ہوں یا معزز و محترم شخصیت ہو جسے بھی کوئی مشرک نظر آئے وہ (مشرک) پناہ گزیں ہے یہاں تک کہ پیام الٰہی کو سن لے

---

[1] ص ۳۴۴، ج ۱۱ الوسایل۔

اگر وہ تمہاری پیروی کرے (اسلام لے آئے) تو وہ تمہارا دینی بھائی ہوگا۔ اور اگر حق کی پیروی سے انکار کر دے تو اس کو جائے امن تک پہنچا دو اور خدا سے مدد طلب کرو۔"

۶۔ معاف کرنا

اسلامی اخلاقیات میں ترکِ غضب کے علاوہ عفو اور اپنے حق سے دستبردار ہونے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن نے بار بار اس کا شوق اور ترغیب دلائی ہے۔

"...فاعفوا و اصفحوا..." (۲ : ۱۰۹)

پس تم معاف کرو اور درگزر کرو

"...خذ العفو..." (۷ : ۱۹۹)

"(اے رسول) تم درگزر اختیار کرنا۔"

ولیعفوا ولیصفحوا[۱] الا تحبون ان یغفر اللہ لکم[۲] (۲۴ : ۲۲)

"بلکہ انہیں چاہیئے کہ (ان کی خطا) معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم یہ نہیں چاہتے ہو کہ خدا تمہاری خطا معاف کرے۔"

---

[۱] بعض اہلِ لغت کا کہنا ہے کہ "عفو" کا معنی گناہ کی سزا سے چشم پوشی کرنا اور صفح کا معنی ملامت کو ترک کرنا ہے۔

[۲] اس آیت شریفہ سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو معاف کرنے کا نتیجہ مغفرت الٰہی ہے۔

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ. (۴۲ : ۳۷)

"اور جب غصہ آجاتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں"۔

فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ط (۴۲ : ۴۰)

"اس پر بھی جو شخص معاف کر دے اور معاملہ کی اصلاح کر دے تو اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے"۔

قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ (۴۵ : ۱۴)

"(اے رسولؐ) مؤمنوں سے کہہ دو کہ جو لوگ خدا کے دنوں کی (جو جزا کے لئے مقرر ہیں) توقع نہیں رکھتے ان سے درگزر کریں"۔

پیغمبر اکرم (ص) ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

"کیا تمہیں دنیا و آخرت کے بہترین اخلاق کی خبر نہ دوں، اس شخص کو معاف کرنا جو تم پر ظلم کرے ــــ اس شخص سے صلہ رحمی کرنا جو تم سے قطع رحمی کرے ــــ اس شخص سے نیکی کرنا جو تمہارے ساتھ بدی کرے"۔[1]

اس مضمون کی بہت تکرار ہوئی ہے اور بعض روایات میں اس جملے کا بھی اضافہ کیا گیا ہے:

"حق بات کرنا اگرچہ اس میں تمہارا ذاتی نقصان ہو"۔[2]

جس عورت نے بکرے کے گوشت میں زہر ملا کر آنحضرتؐ کو کھلایا تھا

---

[1] بحار الانوار، ج ۱۷، ص ۳۹۹ صحیحہ ابن سنان

[2] وسائل ج ۶ ص ۱۶۵۔

جب وہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کی گئی تو آپؐ نے فرمایا: کس چیز نے تمہیں اس کام پہ آمادہ کیا؟ اس عورت نے جواب دیا: میں نے دل میں یہ سوچ کر یہ کام کیا کہ اگر آپؐ واقعی پیغمبرِ خدا ہیں تو یہ زہر آپؐ کو نقصان نہیں پہنچائے گا اور اگر صرف بادشاہ ہیں تو اس طرح لوگوں کو آپؐ سے نجات دلا دوں گی۔ آپؐ نے عورت کا یہ بیان سُن کر اسے معاف کر دیا۔[1]

امام زین العابدین سلام اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"روزِ محشر خداوند عالم تمام لوگوں کو جمع کریگا اس وقت ہاتف پکارے گا صاحبانِ فضیلت کہاں ہیں یہ آواز سُن کر لوگوں کی ایک جماعت کھڑی ہوگی فرشتے ان سے کہیں گے تمہاری کونسی فضیلت ہے؟ یہ لوگ جواب دیں گے جو ہم سے تعلقات منقطع کرتا تھا ہم جاکر اس سے ملتے تھے۔ ان سے کہا جائے گا تم سچ کہتے ہو لہٰذا جنت میں داخل ہو جاؤ"۔[2]

۷۔ نیکی اور احسان کرنا

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں:

لا تزهدن في المعروف عند اهله

"اہل (مستحقین) کے ساتھ نیکی کرنے سے دریغ نہ کرو۔"

---

[1] موثقہ ابی بکیر، ص ۴۰۲، ج ۱ بحار الانوار۔

[2] الوسایل، ج ۶، ص ۱۶۵۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

"واصنع المعروف الی من ھو اھلہ والیٰ من لیس ھو اھلہ فان لم یکن ھو اھلہ فکن انت من اھلہ"

"جو نیکی اور احسان کا اہل اور مستحق ہے، اس کے ساتھ بھی نیکی کرو اور جو اہل نہیں اس کے ساتھ بھی۔ اگر وہ اہلِ احسان نہیں تو تم اہلِ احسان بنو"

نیز صادق آلِ محمد(ع) فرماتے ہیں :

"اصنعوا المعروف الیٰ کل احد فان کان اھلہ والا فانت اھلہ"

"ہر ایک کے ساتھ نیکی کرو! اگر وہ اہلِ احسان ہیں تو بہتر ورنہ تم اہلِ احسان بنو"

لیکن بعض اوقات بروں اور بے دینوں سے نیکی کا اچھا انجام نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے امام(ع) فرماتے ہیں :

"لا تصلح الصنیعۃ الا عند ذی حسب او دین"[1]

"شریف اور دیندار آدمی کے علاوہ کسی پر احسان کرنا مناسب نہیں"

قرآن مجید فرماتا ہے :

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۔ (۱۶:۹۰)

---

[1] الوسایل، ج ۱۱ ص ۵۲۸ تا ۵۳۱ ۔

"خدا انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔"

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲: ۸۳)

"اور لوگوں سے اچھے طریقے سے بات کرو۔"

"ولاخیر فی کثیر من نجواھم الامن امر بصدقۃ او

معروف او اصلاح بین الناس۔" (۴: ۱۱۴)

"(اے رسولؐ) ان کے راز کی باتوں سے اکثر میں بھلائی کا تو نام تک نہیں مگر، ہاں! جو شخص کسی کو صدقہ دینے یا اچھے کام کرنے یا لوگوں کے درمیان میں ملاپ کرانے کا حکم دے۔"

دوسروں کے حق میں سب سے اچھی نیکی اور احسان یہ ہے کہ حقیقت، فضائل اخلاقی، اور شرعی و فقہی تکالیف میں ان کی راہنمائی کی جائے اور ان کو اپنے پروردگار کے نزدیک کیا جائے۔ کافر اور مؤمن دونوں کے حق میں یہ دلسوزی اور ہمدردی، انبیاء علیہم السلام کی صفات میں سے ہے۔

"فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارھم ان لم یؤمنوا بھذا

الحدیث اسفا۔" (۱۸: ۶)

"(اے رسولؐ!) اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو شاید تم مارے افسوس کے ان کے پیچھے اپنی جان دے ڈالو گے۔"

"فلا تذھب نفسک علیھم حسرات۔" (۳۵: ۸)

"تو (اے رسولؐ کہیں، ان (بدبختوں) پر افسوس کر کے تمہارا دم نہ نکل جائے۔"

رسولؐ اسلام لوگوں کی ہدایت کا اتنا شوق اور دلچسپی رکھتے تھے

کہ خالقِ کائنات کو کہنا پڑا :

میرے حبیب دیکھو ! کہیں لوگوں کی ہدایت کے شوق اور حسرت میں اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھنا "

بنا براں ہمیں بھی چاہیئے کہ اپنے نفوس میں یہ شوق زندہ کریں۔

" لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ " (۳۳ : ۲۱)

" (مسلمانو!) تمہارے واسطے تو خود رسول اللہ کا (خندق میں بیٹھنا) ایک اچھا نمونہ تھا "

کیا ہی بہتر ہے کہ ہم بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی اقتداء کریں! لیکن یہ خیال رہے کہ یہ شوق افراط اور انتہا پسندی کی حد تک نہ پہنچے جس کی وجہ سے شرعی اصولوں کے برعکس، اپنے آپ کو اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچائیں اور ہماری آنکھوں پر تعصّب کی پٹی بندھ جائے۔

نیز قرآن فرماتا ہے :

" انہ من قتل نفسًا بغیر نفسٍ او فسادٍ فی الارض فکانما قتل الناس جمیعًا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعًا۔"

(۵ : ۳۲)

" جو شخص کسی کو نہ جان کے بدلے میں نہ ملک میں فساد پھیلانے کی سزا میں (بلکہ ناحق) قتل کر ڈالے گا تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا اور جس نے ایک آدمی کو جِلا لیا تو گویا اس نے سب لوگوں کو جِلا لیا "

روایت میں " ہدایت " سے اس کی تاویل کی گئی ہے (یعنی زندہ کرنے

سے مراد کسی انسان کی ہدایت کرنا ہے) اگر خدا ہمیں ایک انسان کی ہدایت کی توفیق دے دے تو گویا ہم نے تمام لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کی ہے اس کا اجر کتنا عظیم ہوگا؟ لوگوں کو گمراہ کرنے کا گناہ، دوبارہ انہیں ہدایت اور راہِ راست پر لائے بغیر بخشا نہیں جائے گا۔[1] لہٰذا ہر عقلمند ہمیشہ اس بات کا خیال رکھے کہ کہیں دین، مذہب، اصلاحات، انقلاب، پارٹی، آرگنائزیشن، انجمن، جمعیت، جہالت اور فضول باتوں کے مقابلے محروم اور نادار افراد کی مدد اور اس قسم کے دیگر عنوانوں کے ذریعے انسان دوستی کے نام پہ لوگوں کو حق و حقیقت، اخلاقی ضوابط اور شرعی تکالیف کے دائرے سے کوئی خارج اور گمراہ نہ کردے جس کا گناہ بہت زیادہ ہے اور مؤمنین خود بھی متوجہ رہیں کہ کہیں لومڑی صفت اور سر پھرے نادان دین اور دنیا دونوں کو تباہ نہ کریں۔ واللہ المستعان۔

۸۔ برائی کا جواب نیکی سے دینا

بخش دینے اور درگزر کرنے سے بھی بڑھ کر ایک اور فضیلت کا حکم قرآن مجید دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان برائی کا جواب احسان اور نیکی کی صورت میں دے۔

ویدرؤن بالحسنۃ السیئۃ۔ (رعد: ۲۲)

"مؤمنین برائی کا دفاع نیکی کے ذریعے کرتے ہیں۔"

---

[1] حدود الشریعۃ فی محرماتہا، ج ۲ مادہ ضلال۔

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵ : ۶۳)

"نادانوں کی بدگوئی کا جواب سلام سے دیتے ہیں۔"

سورۂ سجدہ میں خالقِ کائنات فرماتا ہے:

خوبی اور بدی یکساں نہیں ہو سکتے، بدی کو اس سے اچھی چیز کے ذریعے دور کرو تاکہ اس سے تمہارا دشمن اچانک تمہارا دوست بن جائے۔"

لیکن اس کام کو سوائے صاحبان صبر اور خوش قسمت افراد کے کوئی آدمی ماننے کے لئے تیار نہیں۔

۹۔ حسد نہ کرنا

حسد کا مطلب یہ ہے کہ انسان دوسروں کے پاس موجود خداداد نعمتوں کے زوال کی تمنا کرنے لگے۔

لیکن اگر یہ نعمتیں دوسرے کے مفاد میں نہ ہوں تو اسے غیرت کہتے ہیں حسد نہیں اور اگر انسان نعمتیں اپنے لئے چاہے اور دوسرے سے ان کے زوال کی تمنا نہ کرے تو اسے رقابت، "غبطہ" یا رشک کہتے ہیں۔

اصول کافی کی ایک معتبر روایت میں مذکور ہے:

"مؤمن رقابت اور رشک کرتا ہے حسد نہیں کرتا منافق حسد کرتا ہے رقابت اور رشک نہیں کرتا۔"

بہرحال حسد کی ضد کا نام نصیحت رکھا گیا ہے اور اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ انسان دوسروں کی نعمتوں کے بقاء کا ارادہ رکھے۔

حسد اخلاقی صفات میں ایک بدترین صفت ہے جس کا ضرر اور نقصان وجدانی ہے، ہر حاسد خود اپنا حسد محسوس کرتا ہے اور ہر وقت غم واندوہ کے زنداں میں رہتا ہے اسے سکون اور آرام میسّر نہیں ہوتا۔

حسد اور حاسد کے بارے میں امیرالمؤمنین علیہ السلام سے کچھ جملے منقول ہیں جن کا ضعیف السند ہونا ان کی تصدیق سے مانع نہیں بن سکتا۔ بالفاظ دیگر سند کی کمزوری کے باوجود حضرتؑ کے یہ جملے قابلِ تصدیق ہیں اور ان جملوں سے استفادہ کرنا چاہیئے۔[1]

حاسد اپنے حسد کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے۔ اگر اس کی قدرت میں ہو تو ہولناک جرائم کا منبع اور سرچشمہ بن سکتا ہے۔

"مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ" (۱۱۳: ۵)

"کہہ دیجیئے حاسد کے حسد سے جب وہ حسد کرے خدائے فلک کی پناہ مانگتا ہوں"

یہ آیت کریمہ حسد کی اس خباثت اور پلیدی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو حاسد سے صادر ہونے والے ممکنہ جرائم میں دخیل اور مؤثر ثابت ہو سکتی ہے۔

حسد کے نتیجے میں توہین، استہزاء، تمسخر، ظلم، حق تلفی، بلکہ خونریزی اور اس قسم کی دوسری معصیتیں سرزد ہو سکتی ہیں۔

---

[1] بحارالانوار، ج ۷، ص ۲۵۶۔

۲۔ "أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ" (۴ : ۵۴)

"کیا یہودی، لوگوں سے ان چیزوں کی وجہ سے حسد کرتے ہیں جو خدا نے اپنے فضل وکرم سے انہیں دی ہیں"۔

۳۔ روایت صحیحہ میں یونس نے رقی سے اس نے امام صادق علیہ السلام سے اور آپ (ع) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے روایت فرماتے ہیں، حضور (ص) نے فرمایا:

"خداوند عالم نے حضرت موسیٰ بن عمران سے خطاب کیا لوگوں سے ان نعمتوں کی وجہ سے حسد نہ کرو جو میں نے اپنے فضل وکرم اور رحمت سے انہیں دی ہیں، کیونکہ حاسد میری نعمتوں سے خفا ہے اور لوگوں کے درمیان میری تقسیم کو روکنا چاہتا ہے"۔

ایک اور صحیح روایت میں امام باقر سلام اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"حسد ایمان کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے"۔[۱]

امام صادق علیہ السلام روایتِ صحیحہ میں فرماتے ہیں:

تین چیزیں دین کے لئے آفت ہیں:

(i) حسد

(ii) خود پسندی

(iii) فخر ومباہات"۔[۲]

حسد کے اسباب

اکثر اوقات حسد، محسود سے دشمنی یا نفس کی خباثت (پلیدی)

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۲۱۶ ۔ ۲۔ ص ۴۱۸

اور کمزوری کی وجہ سے وجود میں آتا ہے حاسد دوسروں کے پاس کوئی نعمت دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ کبھی ہوسِ اقتدار، حبِ مال و مقام کی وجہ سے رشک کیا جاتا ہے اور کبھی تکبر، مفادات کے فوت ہو جانے اور کسی دوسرے پر تجاوز اور زیادتی کی وجہ سے حسد کیا جاتا ہے۔ خداوند عالم ہمیں توفیق دے کہ ہم حسد کے مفاسد اور نقصانات کے بارے میں سوچیں اور اس سے دور رہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ صرف حسد ہی کو ترک نہ کریں بلکہ مؤمنین کے لیے خیر خواہ ثابت ہوں۔

امام صادق علیہ السلام موثقہ سماعہ میں فرماتے ہیں:

"جو اپنے مؤمن بھائی کے ساتھ کسی کام کے لئے جائے اور اس کی خیر خواہی کا مظاہرہ نہ کرے تو اس نے خدا اور رسول سے خیانت کی"[1]

نیز روایت صحیحہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"یجب للمؤمن علی المؤمن النصیحہ لہ فی المشہد و المغیب"[2]

"مؤمن کا فرض ہے کہ وہ اپنے برادر مؤمن کو نصیحت کرے، اس کی موجودگی میں بھی اور اس کی عدم موجودگی میں بھی"

خیر خواہی اور نصیحت کا ایک مظہر یہ ہے کہ جاہلوں کی راہنمائی کی جائے اور ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا جائے جسے اسلام میں واجب قرار دیا گیا ہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی تفصیل اس کتاب کے دائرے سے

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۶۸۔

[2] وسائل، ج ۱۱، ص ۵۹۷۔

خارج ہے تاہم اسلامی تعلیمات کے شاہکاروں میں سے ہے کہ جب تک انسان خود عمل نہ کرے، دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ" (۶۱ : ۲)

"جس بات پر خود عمل نہیں کرتے وہ بات کیوں کہتے ہو؟"

ایسی روش غضبِ الٰہی کا باعث بنتی ہے۔

بہر حال جاہلوں کے مقابلے میں ہمارا شرعی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

حسد کا فقہی حکم

شیخ طوسی علیہ الرحمۃ سے نقل کیا گیا ہے کہ حسد مکروہ ہے۔

اور علامہ علیہ الرحمۃ ابن ادریس کی اتباع کرتے ہوئے فرماتے ہیں حسد حرام ہے۔[1]

صاحب جواہر فرماتے ہیں کہ حسد کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں یعنی بالاتفاق یہ حرام ہے۔

حسد کے حرام ہونے کی عمدہ اور اہم دلیل معصومؑ کا یہ فرمان ہے:

"الحسد یاکل الایمان"

"حسد ایمان کو کھا جاتا ہے"

ظاہر ہے ایک مکروہ عمل کا اثر ایمان پر اتنا زیادہ نہیں ہوا کرتا لیکن حسنہ حریز میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۲۳۹

وآلہ وسلم سے یہ روایت نقل فرمائی ہے :

"رفع عن امّتی تسعة اشیاء : الخطاء والنسیان و ما اکرھوا علیہ و ما لایعلمون وما لا یطیقون و ما اضطروا الیہ والحسد والطیرة والتفکرفی الوسوسة فی الخلق (المخلوق) مالم ینطقوا بشفة "۔[1]

"میری امت سے نو چیزیں اٹھادی گئی ہیں اگر کوئی ان کا مرتکب ہو تو اسے عذاب نہیں کیا جائے گا)

(i) خطا، عمداً نہیں بلکہ غلطی سے گناہ کا مرتکب ہونا .

(ii) بھول کر کوئی گناہ کر بیٹھے.

(iii) وہ فعل حرام جس پر کسی کو مجبور کیا جائے.

(iv) وہ حرام کام جس کا علم نہ ہو.

(v) وہ کام جو قدرت سے باہر ہو.

(vi) وہ کام جو ناگزیر ہو.

(vii) حسد

(viii) طیرہ (فال بد)

(ix) مخلوقِ خدا کے بارے میں وسوسہ اور اندیشے کا شکار ہونا، جب تک منہ سے نہ بولے"

میں عرض کرتا ہوں کہ اگر "مالم ینطقوا" کی قید کا تعلق صرف آخری

---

[1] الوسائل، ج ۱۱ ص ۲۹۵ نقل از توحید و خصائل .

اور نویں چیز سے ہو یعنی صرف "تفکر فی الوسوسہ فی الخلق" ایسا عمل ہے کہ جب زبان سے اس کو ظاہر نہ کیا جائے گا حرام نہیں ہوگا۔ تو اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ "حسد" اور "طیرۃ" وغیرہ ہر حالت میں مرفوع ہیں۔ (ان کا گناہ نہیں) اگرچہ اس کا اظہار زبان سے بھی کیا جائے۔ بنا برایں جو دلیل حسد کے حرام ہونے پہ دلالت کرتی ہے اسے کراہت پر حمل کریں گے (مکروہ سمجھیں گے) اور اگر اس شرط و قید میں صرف وہی حسد مرفوع اور بلاعقاب ہوگا جو زبان سے ظاہر نہ کیا جائے۔ اور اگر زبان سے ظاہر کیا جائے تو حرام ہوگا اور اگر شک ہو جائے اور واضح نہ ہو کہ اس قید کا تعلق آخری چیز (التفکر فی الخلق) سے ہے یا تینوں (حسد، طیرۃ، التفکر فی الخلق) سے ہے تو کہا جائے گا کہ یہ جملہ ایسی چیز پر مشتمل ہے جس میں قرینہ بننے کی صلاحیت ہے یعنی قید کا تعلق آخری چیز کی طرح حسد سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں وہی حسد یقینی طور پہ مرفوع القلم ہوگا جس کا زبان سے اظہار نہ کیا جائے اور اگر زبان سے ظاہر کر دیا گیا تو حرام ہوگا۔ اس قید کا تعلق تینوں (حسد، طیرۃ، التفکر فی الخلق) صفات سے ہونے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قید میں جمع کا صیغہ "ینطقوا" استعمال کیا گیا ہے یعنی حسد، طیرۃ، التفکر فی الخلق تب مرفوع ہوں گے جب حاسد فال بد کرنے والا اور متفکر فی الخلق ان چیزوں کو زبان سے ظاہر نہ کرے

لیکن مرحوم صدوق نے اپنی کتاب "توحید" میں اس روایت کو صیغہ مفرد (ما لم ینطق) کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔[1]

---

[1] بحار، ج ۲، ص ۲۰۸۔

بعض علمائے کرام جو حسد کو مکروہ سمجھتے ہیں اس روایت کو سند کے اعتبار سے ضعیف قرار دیتے ہیں۔ جس کا ذکر میں اپنی کتاب "حدود الشریعہ فی محرماتہا" جلد ۱ مادہ "الحسد" میں کر چکا ہوں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس حدیث کا راوی محمد بن یحییٰ ظاہراً حَسَن ہے۔ کیونکہ مرحوم صدوق نے مکرر ان کے لئے رحم کی دعا فرمائی ہے (یعنی نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا ہے) تحقیق کے لئے کتاب "بحوث فی علم الرجال" کی طرف رجوع فرمایئے۔

۱۰۔ تواضع۔ تکبر سے اجتناب

عجب خود پسندی کا نام ہے اور احساسِ برتری کو کبر کہا جاتا ہے اور تکبر ان آثار اور اعمال کا نام ہے جو رفتار و گفتار اور دوسروں کے ساتھ رہن سہن کے دوران متکبر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ قرآن و سنت میں اس کی بہت زیادہ مذمت کی گئی ہے:

"فادخلوا ابواب جهنم خالدين فيها فلبئس مثوى المتكبرين" (۱۶: ۲۹)

جہنم کے دروازوں میں جا کر داخل ہو اور اس میں ہمیشہ رہو گے۔ غرض تکبر کرنے والوں کا بھی کیا برا ٹھکانہ ہے"۔

اگر تکبر، حق، آیات اور عبادتِ الٰہی کے مقابلے میں ہو تو ایسے تکبر کا نتیجہ بعض اوقات کفر بھی ہو سکتا ہے جس طرح کہ ابلیس کا کفر اور تکبر تھا۔ شاید اکثر آیات و روایات کا اشارہ تکبر کی اسی قسم کی طرف ہو۔ بعض اوقات

تکبر، لوگوں کے مقابلے میں ہوتا ہے جو بہت ہی برا، تکلیف دہ اور لوگوں کی نفرت کا باعث بنتا ہے۔ تکبر فقہی نقطۂ نگاہ سے بھی کسی حد تک حرام و ممنوع ہے۔

"وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ۔" (لقمان: ۱۸)

لاپرواہی اور تکبر کی بنا پر لوگوں سے منہ نہ پھیرو اور روئے زمین پر زیادہ خوشی اور غرور کے ساتھ نہ چلو، خدا تکبر اور فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا"۔

ذیل میں "وسایل" کی جلد نمبر ۱۱ سے چند معتبر الاسناد روایات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ "عزت اور بڑائی خدا کی ذات سے مخصوص ہے، جو شخص بھی اس میں سے کچھ اپنے لئے لے گا خداوند اسے جہنم میں ڈال دے گا"۔

البتہ باعزت اور محترم ہونا کوئی ممنوع نہیں ہے، اس کی طرف قرآن میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، لہٰذا یہ مسلم ہے کہ اس روایت میں عزت سے مراد غیر شرعی اور ناجائز عزت ہے۔

۲۔ جہنم کی ایک وادی متکبرین کے لئے مخصوص ہے جس کا نام سقر ہے۔ اس وادی نے خدا کے دربار میں شدت حرارت کی شکایت کی، جس پر اسے سانس لینے کی اجازت دی گئی جب اس وادی نے سانس لیا تو سارا جہنم جلنے لگا"۔

۳۔ "سب سے بڑا تکبر یہ ہے کہ انسان حق شناس نہ ہو اہلِ حق پر طعن کرے اور عیب لگائے یہ اسطرح ہے کہ گویا وہ خدا کے ساتھ

جھگڑ رہا ہے"۔

۴۔ یہ روایت پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے۔

"کفر کی بنیادیں، حسد، حرص اور تکبر ہے"[1]

بنا بر ایں انسان کو چاہیئے کہ وہ دوسروں کو ذلیل و خوار تصور نہ کرے اور نہ خود کو بہتر و بالاتر سمجھے بایں معنی کہ یہ خیال و تصور اس کے حرکات و سکنات سے ظاہر نہ ہو۔ اس سے زیادہ دقیق بحث علم فقہ میں ہونی چاہیئے اچھی اور قابلِ تعریف صفات میں سے ایک تواضع اور فروتنی ہے اس کی تفسیر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تواضع کسرِ نفسی اور دوسروں کے احترام کا نام ہے۔

تواضع آیات و روایات کی روشنی میں:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا۔ (۲۵ : ۶۳)

۱۔ "خداوند رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر سکون اور تواضع سے چلتے ہیں اور جب نادان لوگ ان سے مخاطب ہوں (بد اخلاقی سے پیش آئیں) تو یہ ان کا جواب سلام سے دیتے ہیں"۔

۲۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۲۶ : ۲۱۵)

"(اے میرے رسول) اپنے پیروکاروں اور ماننے والوں کے ساتھ تواضع اور مہربانی سے پیش آیا کرو"۔

---

[1] ج ۳، ص ۲۹۶ کافی۔

۳۔ امام صادق علیہ السلام صحیحہ معاویہ میں فرماتے ہیں:

"آسمان پر دو فرشتے ہیں جو بندوں پر مؤکل ہیں اور ہر اس شخص کا مقام بلند کرتے ہیں جو خدا کی خاطر تواضع سے کام لے اور ہر اس شخص کو پست کرتے ہیں جو تکبر اور غرور کرے"۔[1]

۴۔ امام باقر علیہ السلام موثقہ محمد بن مسلم میں فرماتے ہیں:

"ایک فرشتے نے پیغمبر اکرم (ص) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی، خداوند آپ کو اختیار دے رہا ہے کہ آیا بندۂ خدا رسول اللہ اور متواضع بننا چاہتے ہیں یا بادشاہ بننا چاہتے ہیں؟ آپؐ نے جبریلؑ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جبریلؑ نے کہا کہیے متواضع بننا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ بندہ متواضع اور رسول بنوں"۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسان کبر یا تکبر کے موقع پر امیر المؤمنین علیہ السلام کے اس فرمان کی طرف توجہ کرے تاکہ اس مرض سے نجات حاصل کر سکے۔

آپؐ نے فرمایا:

"عجبت لابن آدم اوله نطفة و آخره جيفة و هو قائم بينهما وعاء للغائط ثم يتكبر"[2]

مجھے تعجب ہے اس اولاد آدم پر جس کا آغاز نطفہ سے اور اختتام و انجام مردار

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۸۵۔

[2] بحار الانوار، ج ۷۳، ص ۲۳۴۔

پر ہوگا۔ انسان ان دونوں کے درمیان پاخانے کا برتن (بیت الخلاء) بن کر کھڑا ہے۔ پھر بھی یہ تکبر کرتا ہے:"

اولت بود یکی قطرہ آب | کہ از آن شستن ثوب است صواب
از شکم تا بکنار آمدہ ای | از رہ بول دو بار آمدہ ای
آخرت جیفہ افتادہ بخاک | کردہ پنہان بیکی تیرہ مغاک
بر تو آن پردہ بفرض ار بدرند | چشم نابستہ کسان کم گذرند
در میانہ کہ سراسر خوشی است | روز و شب کار تو سرگین کشی است
تنت آراستہ از در و گہر | چون شکمبہ شکم از سرگین پُر
گر بخود نیست شناسا ور بیت | لب کشا دم بہ شناسا گر بیت
از من این نکتہ فراموش مکن | مدحت مدرح گران گوش مکن

توجہ طلب نکتہ

انسان کو چاہیئے کہ تکبر سے بچنے کی خاطر اپنے آپ کو ذلیل و رسوا بھی نہ کرے۔

وہ فرد، قوم و ملّت جو اعتماد بہ نفس اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھے، اپنے لئے کسی عزت و شخصیت کی قائل نہ ہو اور ذلت قبول کرے، ایسی قوم اور فرد نہ کمالِ انسانی حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی مقام معنوی اور قرب الٰہی کو پہنچ سکتا ہے، جو لوگ خود کو حقیر اور ذلیل تصور کرتے ہیں وہ ہر قسم کی رسوائی اور معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں، اور کسی بھی فضیلت اور کمال کو حاصل کرنے کی ہمّت نہیں کرتے۔

اسلامی اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ تواضع کے ذریعے تکبر اور عزت کے ذریعے

ذلت سے دُور رہا جائے۔

معلوم یہ ہوا کہ مومن متواضع بھی ہوتا ہے اور معزز و محترم۔

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۸:۶۳)

"عزت تو خاص خدا اور رسول اور مؤمنین کے لئے ہے۔"

اسلامی فقہ میں غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام قرار دیا گیا ہے چاہے وہ رسول ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ غیر خدا کو سجدہ کرنا ذلت و خواری کا مظہر ہے اور مسلمانوں کو اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے ذریعے دوسروں کو چاپلوسی اور منت اور سماجت سے دُور رکھا گیا ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ اگر مؤمن ذلیل نہیں تو اس آیۂ کریمہ کا کیا مطلب ہے؟

فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ۔ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ۔ (۵:۵۴)

"عنقریب خداوند تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا جس کو وہ دوست رکھتا ہے اور وہ قوم خدا کو دوست رکھتی ہے۔ یہ قوم مؤمنین کے مقابلے میں ذلیل اور کفار کے مقابلے میں با عزت ہوگی۔ راہِ خدا میں جہاد کرے گی اور اس سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اسے کوئی خوف نہیں ہوگا۔"

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آیہ کریمہ میں ذلت سے مراد تواضع اور نرمی ہے۔ نفس کی توہین مراد نہیں اور ممکن ہے کفار کے مقابلے میں باعزت ہونے سے مراد تکبر نہ ہو بلکہ اس سے مراد یہ ہو کہ کفار کے پاس جو مال و دولت موجود ہے اس کی اس مؤمن کی نظر میں کوئی وقعت نہیں۔

ایک احتمال یہ ہے کہ عزت سے مراد کافر کے مقابلے میں تکبر ہو۔ واللہ العالم۔

بعض معتبر روایات میں وارد ہے کہ خالق فرماتا ہے "جس نے میرے کسی دوست کی تذلیل و توہین کی گویا اس نے مجھ سے جنگ کی ہے۔

ہو سکتا ہے یہ اور اس قسم کی دیگر روایات، دوسروں کی توہین کی طرح اپنی توہین کو بھی شامل ہوں کیونکہ جس وجہ سے دوسروں کی توہین جائز نہیں وہی وجہ اپنے نفس کے لئے بھی موجود ہے۔[1]

مجھے افسوس ہے کہ اخلاق کی بعض کتابوں میں تکبر کو دور کرنے کی ایسی ایسی تاکید اور تجاویز ذکر کی گئی ہیں جو اسلامی اخلاق سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ بلکہ تصوف کے بعض پیشواؤں کے بارے میں یہاں تک منقول ہے کہ وہ تواضع کے تحفظ کی خاطر فعل حرام کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ کتنی بڑی نادانی اور گمراہی ہے!

۱۱۔ لڑائی جھگڑے سے بچنا

مرحوم مجلسی فرماتے ہیں:

مراء اس جھگڑے اور گفتگو کو کہا جاتا ہے جو اظہار کمال اور فخر و مباہات کی خاطر کی جائے اور اگر کسی حق کو ثابت کرنے کے لئے جھگڑا کیا جائے تو اس

---

[1] روایات بتاتی ہیں کہ مؤمن کو تذلیل نفس کا اختیار نہیں دیا گیا مؤمن کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ (تفسیر برہان، ج ۴، ص ۳۳۹)۔

کی تعریف کی گئی ہے۔ اس موضوع پر جتنی روایات نقل کی گئی ہیں مجموعی طور پہ ان سے مراء کی قباحت ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک روایت ہیں امام جعفر علیہ السلام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں، آنحضرتؐ نے فرمایا:

"سب سے پہلی چیز جس سے خدا نے مجھے روکا ہے وہ بت پرستی، شراب نوشی اور لوگوں سے لڑنا جھگڑنا ہے۔"

راغب نے مفردات میں لکھا ہے:

مراء کا مطلب یہ ہے کہ شک و تردید کے ساتھ جھگڑا کیا جائے۔

راغب کی نظر میں مراء مریہ سے بنا ہے۔

مرحوم نراقی فرماتے ہیں:

مراء کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو ضعیف و کمزور کرنے کے لئے اس کے کلام کو عیب دار بنا دیا جائے، جس کا مقصد اس کی توہین اور اپنی برتری ثابت کرنا ہو۔

مرحوم نراقی کی رائے کے مطابق جدال، اعتقادی مسائل کے اظہار کے موقع پر ہوا کرتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ. (۲۲ : ۸)

"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر علم، ہدایت اور روشن کتاب کے۔"

خصومت، کسی مال یا مطلوبہ حق کو ثابت کرنے کے لئے ضدی بننے کو کہتے ہیں۔ بنابراین مراء بری اور قابلِ مذمت صفت ہے۔ لیکن جدال وخصومت

اگر بر حق اور برائے حق ہو تو ممدوح ورنہ مذموم ہے۔

مگر علمی مباحث میں لجاجت و ضدی پن اور کلام کو طول دینا اگرچہ توہین کی غرض سے نہ ہو پھر بھی قبیح اور معیوب ہیں اور یہ آخر کار انسان کو عداوت، کینہ، خود پسندی اور تکبر تک پہنچا دیتے ہیں لہٰذا طلاب علوم کو چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے ان سے احتراز کریں۔

۱۲۔ صداقت

فضائل اخلاق میں سے ایک صداقت ہے جو بہت قیمتی صفت ہے صدق و ادائے امانت کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں اس کی ضد جھوٹ ہے جو اخلاقی رذائل میں سے ہے اور فقہی اعتبار سے حرام ہے۔ اس کی بہت زیادہ مذمت کی گئی ہے۔

جھوٹ کی سب سے بڑی قسم، ناحق گواہی، جھوٹی قسم، خدا و رسول پر جھوٹ باندھنا اور وہ جھوٹ ہے جو گمراہی کا باعث بنے۔

وعدہ خلافی منجملہ رذائل اخلاقی میں سے ہے جس کی حرمت کے بارے میں فقہ میں بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ اگر وعدہ کرتے وقت ہی اس کی مخالفت کا ارادہ رکھتا ہو تو یہ حرام ہے اور اگر وعدے کے بعد یہ پروگرام ہو تو راقم کی نظر میں خالی از اشکال نہیں۔ اگرچہ فقہائے امامیہ میں شاید مشہور یہی ہے کہ جائز ہے۔

صحیحہ شعیب میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو شخص خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ وہ اپنا

وعدہ وفا کرے۔

صحیحہ ہشام میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

عدة المؤمن اخاه نذر لا كفارة له فمن اخلف الله فبخلفه بداء ولمقته تعرض وذالك قوله: ... لم تقولون مالا تفعلون.

مؤمن بھائی سے کوئی بھی وعدہ کرنا ایک ایسی نذر ہے جس کا کفارہ نہیں ہے۔ (یعنی جس کو پورا نہ کرنے سے کفارہ واجب نہیں ہوتا) جو بھی وعدے کی مخالفت کرے اس نے خدا سے وعدے کی خلاف ورزی کا آغاز کر دیا ہے اور اپنے آپ کو موردِ غضبِ الٰہی ٹھہرایا ہے[1] چنانچہ خالق کا فرمان ہے: تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے۔

۱۳- عدالت

مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی پر بھی ظلم و ستم نہ کریں اور نہ دوسروں کے حقوق پر تجاوز کریں۔ ان حقوق کی حدود فقہ میں بیان کر دی گئی ہیں۔

"وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (۴: ۱۰۵)

"خیانت کرنے والے کے طرفدار نہ بنو"

عہد و پیمان کی مخالفت ایک قسم کا ظلم ہے۔ لوگوں کے سامنے حق و باطل

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۶۸۔

کو آپس میں نہ ملائے۔ شہادت اور گواہی نہ چھپائے۔

امام صادق علیہ السلام روایت صحیحہ میں فرماتے ہیں:

"ان من اعظم الناس حسرۃ یوم القیامۃ من وصف عدلا ثم خالفہ الی غیرہ"[1]

"روز قیامت زیادہ حسرت اور افسوس اس شخص کو ہوگا جو لوگوں کے سامنے تو عدالت کی خوب تعریف کرے مگر عملی طور پر وہ عدالت کی مخالفت کرے"

ایک چونکا دینے والی روایت

"من ظلم مظلمۃ اخذ بھا فی نفسہ او فی مالہ او فی اولادہ"

جو شخص ظلم کرے اس کا بدلہ اس (ظالم) کے نفس، مال یا اس کی اولاد سے لے لیا جاتا ہے۔[2]

یہ جان لینا چاہیئے کہ ظلم کی کئی قسمیں ہیں:

۱۔ دوسروں پر ظلم کرنا،

۲۔ ایک دوسرے پر ظلم کرنا،

۳۔ حیوانات پر ظلم کرنا،

۴۔ کسی جماعت یا گروہ پر ظلم کرنا، چاہے ظالم ایک آدمی ہو یا کئی ہوں۔

---

[1] الوسایل، ج ۱۱، ص ۳۲۰ پر رجوع کیجئے۔

[2] اصول کافی جلد ۴، ص ۲۳، باب ظلم۔

۵۔ حکومت کا رعایا پر ظلم کرنا،

۶۔ ایک حکومت کا دوسرے ملک پر ظلم کرنا،

۷۔ امریکہ روس جیسی سپر طاقتوں کا دوسرے ممالک اور مملکتوں پر ظلم کرنا۔

ظلم کے محرکات بھی مختلف ہوا کرتے ہیں، کبھی ظلم کا محرک اور مقصد ذاتی اور انفرادی مفادات ہوتا ہے۔ کبھی حکومتی مفادات پیش نظر ہوتے ہیں یہاں تک کہ یہ ظلم بین الاقوامی استعمار اور استثمار کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ بعض اوقات صرف جنسی (ذاتی خباثت اور نحوست) ظلم کا سبب بنتی ہے کبھی ظلم کا باعث دینی و مذہبی تعصب ہوتا ہے اور کبھی نسلی، قومی، علاقائی اور رشتہ داری کا جذبہ موجب ظلم ہوا کرتا ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ کسی پر ظلم نہ کرے اور ہر وقت اپنے آپ کو حق کی حدود میں مقید سمجھے اور عادل بنے۔ کسی انسان کے سامنے بعض افراد دوسروں پر انفرادی یا اجتماعی طور پر ظلم کریں تو اس کے مقابلے میں خاموش تماشائی نہ بنا رہے بلکہ ظلم کے خاتمے اور عدالت کے قیام کی خاطر عقلی و شرعی حد تک مقابلہ کرے۔

۱۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ۔ (حدید: ۲۵)

۲۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

(نساء/۱۳۵)

۳۔ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ (اعراف: ۲۹)۔

۴۔ كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (مائدہ/ ۸)

۵۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل/۹۰)

۶۔ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (شوریٰ/۱۵)

۷۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا۔ (مائدہ/۸)

۸۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰی (انعام/۱۵۲)

ترجمہ

۱۔ ہم نے اپنے رسول کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان پہ کتاب و میزان نازل کی تا کہ لوگ عدل قائم کریں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں کارزاروں کی سختی بھی ہے اور لوگوں کے مفادات بھی تاکہ معلوم ہو خدا اور اس کے رسولوں کی مدد کون کرتا ہے۔

۲۔ اے صاحبانِ ایمان! عدل کے ساتھ قیام کرنے والوں میں سے بنو اور خدا کی گواہی دو۔

۳۔ اے رسول! کہہ دیجئے میرے ربّ نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔

۴۔ خدا کے لئے قیام کرو اور عدالت کی شہادت دو۔

۵۔ خداوند عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

۶۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدالت قائم کروں۔

۷۔ کسی قوم سے دشمنی تمہیں بے انصافی پر آمادہ نہ کردے۔

۸۔ گفتگو کے دوران عدالت کا خیال رکھو اگرچہ اس میں تمہارے قریبی رشتہ داروں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

البتہ فقہی اصولوں کو مدنظر رکھ کر مقابلہ ہونا چاہیئے تاکہ مکلّف افراد افراط وتفریط کا شکار نہ ہو جائیں۔

جن عنوانات اور موضوعات کے ذریعے اس مقابلے کو مخصوص خطوط پر جاری رکھا جاتا ہے وہ امر بہ معروف، نہی از منکر، فساد کی جڑ کا خاتمہ کرنا، دین کا دفاع، جہاد، دفاع از نفس، باغیوں سے جنگ اور اس قسم کے دیگر عنوانات ہیں، جن کے بارے میں مکمل اور دقیق بحث علم فقہ سے مربوط ہے۔ اگرچہ راقم نے اس کتاب میں اخلاق اور فقہ کے ضابطوں کا خیال الگ الگ نہیں رکھا بلکہ ابھی تک ان دونوں میں دقیق فرق کو بھی نہیں سمجھ سکا۔

۴۱۔ ظالموں کی طرف رجحان

ظالموں کا معتقد بننے اور ان کی طرف میلان و رجحان رکھنے سے قرآن مجید نے منع فرمایا ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوٓا۟ إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ فَتَمَسَّكُمُ ٱلنَّارُ ۔ (ہود/۱۱۳)

"اور ان لوگوں کی طرف مائل نہ ہونا جنہوں نے ظلم کیا ہے ورنہ تم تک بھی آتش جہنم آلپیٹے گی۔"

یہ عجیب بات ہے کہ کفار سے ابتدائی جہاد (جو اہم اسلامی فرائض میں سے ہے) کو ظالموں کی معیت میں ناجائز قرار دیا گیا ہے اور اگر کفار سے جنگ کے نتیجے میں بھی ظالموں کی تقویت ہوتی ہو تو بھی (تقویت) مباح نہیں ہو سکتی[1] (البتہ دفاع از اسلام کا حکم الب... نہیں ہے)۔

---

[1] وسائل، ج ۱۱، ص ۲۰

باب دوم

مختلف لوگوں کے ساتھ انسانی اخلاق

ذیل میں بعض گروہوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ مسلمان اور مؤمنین

۲۔ کفار

۳۔ بُرے اور نادان لوگ

۴۔ والدین

۵۔ اولاد

۶۔ قریبی رشتہ دار

۷۔ ہمسائے

۸۔ اہلِ علم

۹۔ بزرگ افراد

۱۰۔ مرد اور عورتیں

۱۱۔ حکومت اور رعایا

۱۔ مسلمانوں اور مؤمنین کے ساتھ اخلاق

مؤمنین سے محبت کے ساتھ پیش آنے کے بارے میں متعدد روایات موجود ہیں[1]

۱۔ امام صادق علیہ السلام صحیحہ جمال میں فرماتے ہیں:

جہاں کہیں بھی دو مؤمن آپس میں ملاقات کریں ان میں سے زیادہ بافضل وہ مؤمن ہے جس کے دل میں دوسرے مؤمن بھائی کی محبت زیادہ ہو۔

۲۔ مسلمانوں کو رنج اور دکھ پہنچانا حرام ہے اور اس اخلاقی ادب کی طرف ہماری اخلاقی زندگی میں زیادہ سے زیادہ توجہ کرنا چاہیئے اس سلسلے میں کافی روایات بھی موجود ہیں[2]

ایک صحیح حدیث میں مؤمن کو اذیت پہنچانے کو خدا سے جنگ قرار دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں بھی ایذائے مؤمن کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۔ (۳۳: ۵۸)

"یہ لوگ بہتان اور آشکار گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں"

۳۔ چغل خوری اور مؤمنین کے درمیان عداوت پیدا کرنا بدترین طریقہ ہے

---

[1] ص ۴۳۹، ج ۱۱ الوسائل۔

[2] اصول کافی، ج ۴، ص ۵۱ تا ۵۷

اور شرعاً بھی حرام ہے۔[1]

۴۔ مؤمن پر تہمت لگانا حرام ہے۔

اور صحیح روایت میں معصومؑ فرماتے ہیں جو کوئی اپنے مؤمن بھائی پر کوئی تہمت لگائے اس کا ایمان زائل ہو جاتا ہے۔

انماث الایمان من قلبہ کما ینماث الملح فی الماء[2]

"اس کا ایمان اس طرح گھل جاتا ہے جس طرح پانی میں نمک گھل جاتا ہے"

۵۔ مؤمنین کے عیوب کی کھوج میں نہ رہیں (ولا تجسسوا) (۴۹:۱۲)

معتبر روایات بتاتی ہیں کہ جو بھی کسی جگہ سے مؤمن کے گھر کے اندر جھانکے اس کی آنکھ پھوڑی جا سکتی ہے۔ اس تعبیر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے اس سلسلے میں کتنا سخت مؤقف اختیار کیا ہے۔

اس کی مفصل بحث کتاب "حدود الشریعہ فی محرماتہا" کے جزء دوم مادہ اطلاع میں موجود ہے۔ یہ روایات الوسائل کی ج ۱۹ میں ملاحظہ فرمائیے۔

مؤمن کو کسی عیب کی وجہ سے سرزنش نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ سرزنش کرنے والا خود اس عیب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بدترین شقاوت اور بدبختی یہ ہے کہ انسان کسی مؤمن کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرے پھر اس کے عیب گننا شروع کر دے تاکہ اس کے ذریعے کسی نہ کسی دن اس کی سرزنش کر سکے

---

[1] کافی مترجم، ج ۴، ص ۷۰۔

[2] اصول کافی ج ۴ ص ۶۶۔

۷۔ غیبت نہ کریں (غیبت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی عدم موجودگی میں اس کی بدگوئی کی جائے اگرچہ یہ سچ اور واقع کے مطابق ہو)۔

غیبت اہم اور بڑے گناہوں میں سے ہے اور قرآن مجید نے غیبت کو برادر مؤمن کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

موثقہ ابی بصیر میں امام صادق علیہ السلام نے رسول اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مؤمن بھائی کو گالی دینا فسق ہے۔ مؤمن سے جنگ لڑنا کفر ہے اور اس کا گوشت کھانا (غیبت کرنا) معصیت ہے، اور اس کے مال کا اس طرح احترام کرنا چاہیئے جس طرح ان کے خون کا احترام کیا جانا چاہیئے[1]

۸۔ راز فاش کرنا حرام اور غیر اخلاقی ہے[2]

۹۔ مؤمن پر نکتہ چینی اور اس کی تحقیر کرنا بری صفت ہے،

(وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ) (۱۰۴:۱)

۱۰۔ مؤمنین کے بارے میں بدگمانی نہ کی جائے اس لئے کہ یہ بھی حرام ہے۔

اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (۴۹:۱۲)

"اکثر گمانوں سے احتراز کرنا چاہیئے کیونکہ بعض اوقات گمان کرنا گناہ ہوا کرتا ہے۔"

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۴۶۔

[2] اصول کافی ج ۴، ص ۶۲۔

۱۱۔ مؤمنین پر نازل شدہ مصیبت کو ان کے برے اعمال کا نتیجہ نہ سمجھیں۔

۱۲۔ مؤمنین کا مذاق اڑانا، چاہے جس طریقے سے بھی ہو بری عادت بلکہ حرام ہے۔

۱۳۔ مؤمنین سے جدائی اختیار نہ کریں، جب آپس میں تلخ کلامی پیدا ہو تو صلح میں پہل کریں۔ بہتر یہ ہے کہ تین دن سے زیادہ قطع کلامی نہ کریں۔[۱]

جائز مقامات (حدود و تعزیرات) کے علاوہ مؤمن کے گناہوں کی وجہ سے اسکی سرزنش کرنا بری صفت ہے، بعض اوقات تو حرام ہے۔

امر بہ معروف اور نہی از منکر کا مقصد لوگوں کی اصلاح ہے، توہین نہیں البتہ کسی گناہ پر گنہگار کی حوصلہ افزائی کرنا ناجائز ہے اگرچہ گنہگار کافر ہی کیوں نہ ہو۔

۱۵۔ مؤمنین سے بغض و دشمنی رکھنا مذموم ہونے کے علاوہ بعض اخلاقی رذائل اور حرام فقہی تک منتہی ہوتا ہے۔

چنانچہ روایت صحیحہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ایک دوسرے سے بغض رکھنا جڑیں اکھاڑنے کے مترادف ہے اس کے بعد فرماتے ہیں: اس سے میری مراد بال نہیں بلکہ دین کو جڑ سے اکھاڑنا ہے۔[۲]

۱۶۔ مسلمان کو دھوکہ دینا اور حیلہ و مکر کرنا بھی درست نہیں۔

---

[۱] اصول کافی، ج ۴، ص ۴۴۔

[۲] اصول کافی، ج ۴، ص ۴۶۔

۱۷۔ مسلمان کو کھانا کھلانے کا بہت زیادہ ثواب ہے۔[1]

۱۸ مؤمنین کی شرعی اور جائز حاجتیں پوری کرنا بہت بڑی نیکی اور ثواب ہے۔

امام صادق علیہ السلام صحیحہ ہشام میں فرماتے ہیں:

من احب الاعمال الی اللہ ادخال السرور علی المؤمن واشباع جوعتہ او تنفیس کربتہ او قضاء دینہ۔[2]

خدا کے دربار میں سب سے محبوب کام مؤمن بھائی کو خوش رکھنا اور اسے کھانا کھلانا ہے یہاں تک کہ وہ سیر ہو جائے، اس کے ہم و غم کو دُور کرنا اور اس کا قرض ادا کرنا ہے۔

ایک اور صحیح روایت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم فرماتے ہیں:

"جس نے کسی مؤمن کو خوشحال کیا، اس نے مجھے خوشحال کیا اور جس نے مجھے خوشحال کیا گویا اس نے خدا کو خوشحال کیا ہے"۔

من سرّ مؤمنا فقد سرنی و من سرنی فقد سر اللہ[3]

۱۹۔ مؤمنین کے اختلافات دُور کر کے ان میں مصالحت کرانے کا حکم دیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ۔ (۴۹: ۱۰)

۲۰۔ جو شخص اپنے پاس آنے والے مؤمن کا احترام کرے خدا اس

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۲۸۷۔

[2] الوسائل ج ۱۱، ص ۵۷۔ [3] اصول کافی، ج ۳، ص ۱۷۳۔

کا احترام کرتا ہے۔[1]

۱۲۱۔ مؤمن بھائی کی زیارت کرنے کا بہت زیادہ ثواب ہے، ایک روایت میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

جبرئیل نے مجھ سے یہ حکایت بیان کی کہ ایک مرتبہ خدا نے ایک فرشتہ کو زمین کی طرف بھیجا۔ فرشتہ راستے میں جا رہا تھا کہ ایک گھر کے دروازے پر پہنچا جہاں ایک آدمی کھڑا صاحبِ منزل سے گھر میں داخل ہونے کی اجازت مانگ رہا تھا، اس فرشتے نے پوچھا: مالکِ منزل سے تمہارا کیا کام ہے؟ اس آدمی نے جواب دیا: یہ میرا مسلمان بھائی ہے اس کی زیارت کے لئے آیا ہوں فرشتے نے دوبارہ پوچھا: زیارت کے علاوہ تمہارا اور کوئی کام نہیں؟ اس آدمی نے جواب دیا نہیں اور کوئی کام نہیں۔ اس وقت فرشتہ کہنے لگا:

میں خدا کی طرف سے تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں۔ خدا تمہیں سلام کرتا ہے اور فرماتا ہے بہشت تمہارے لئے لازمی اور واجب قرار دی جاتی ہے (آخر میں) اس فرشتے نے کہا: خداوند فرماتا ہے جو مسلمان بھی کسی دوسرے مسلمان بھائی کی زیارت کرے اس نے اس مسلمان کی زیارت نہیں کی بلکہ اس نے میری زیارت کی ہے اور میں اس کا ثواب جنت کی صورت میں دوں گا۔[2]

---

[1] وسائل، ج ۱۱، ص ۵۹۱۔

[2] اصول کافی ج ۳، ص ۲۵۴۔۲۵۹ کافی نے بہترین مضمون کی ۱۶ روایات کو نقل کیا ہے مگر راقم کا شیوہ اختصار ہے۔

۲۲۔ مؤمن سے مصافحہ کا بھی بہت زیادہ ثواب ہے۔ مرحوم کلینی نے کافی میں اس مقام پر ۱۲ روائتیں نقل کی ہیں۔ ہم ان میں سے صرف ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں[1]:

امام باقر علیہ السلام صحیح الحذا میں فرماتے ہیں:

ان المؤمنین اذا التقیا فتصافحا اقبل اللہ علیہما بوجہہ وتساقطت عنہما الذنوب کما یتساقط الورق من الشجر۔

جب دو مؤمن آپس میں ملاقات کریں اور مصافحہ کریں تو خدا ان کی طرف توجہ فرماتا ہے (اس کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی ہے) اور ان کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔

۲۳۔ مؤمنین کا آپس میں معانقہ (بغل گیر ہونا) بہت نیک عمل ہے اس سلسلے میں ایک عجیب روایت موجود ہے چونکہ اس کی سند معتبر ہے اس لئے اس کا یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

جب دو مؤمن ایک دوسرے سے بغل گیر ہوں تو خدا کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی ہے۔ اور اگر مؤمنین کی ملاقات کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہو اور کوئی دنیاوی مقصد نہ ہو تو ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے گناہ بخش دیئے گئے ہیں۔ اس عمل خیر کو دوبارہ شروع کردو۔ جب

---

[1] ص ۲۵۹، ۲۶۵، اصول کافی، ج ۳۔

آپس میں گفتگو شروع کرتے ہیں تو فرشتے (آپس میں) کہتے ہیں دیکھو! ان سے دور رہو یہ (مؤمنین) راز کی باتیں کر رہے ہیں اور خداوند نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

راوی (اسحاق) نے عرض کی: میری جان آپ پر نثار ہو اگر ایسا ہے تو ان کی باتیں تو نہیں لکھی جائیں گی جب کہ خدا فرماتا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (۵۰ : ۱۸)

یعنی انسان جو بھی لفظ بولے۔ رقیب وعتید اس موقع پر حاضر رہتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام نے ایک لمبی سانس لی اور گریہ فرمایا یہاں تک کہ آپ کے آنسوؤں سے آپ کی ریش مبارک تر ہوگئی۔ پھر فرمایا: بہ تحقیق خداوند عالم نے ان دو مؤمنوں کے احترام کی خاطر فرشتوں کو یہ حکم دیا ہے کہ جب یہ (مؤمنین) ایک دوسرے کی ملاقات کے لئے جائیں تو تم ان سے دور رہو۔ اگرچہ فرشتے ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نہ لکھیں اور ان کی باتوں کو نہ جانیں مگر رازوں کا جاننے والا ان کی ہر بات جانتا ہے۔[۱]

مؤمنین کے بارے میں روایات اتنی زیادہ ہیں کہ ان سب کا ذکر ایک مستقل تألیف کا متقاضی ہے اور اصول کافی کا آخری حصہ اس قسم کی روایات کا بہترین مأخذ اور مدرک ہے۔

۲۴۔ مؤمن، ہر مؤمن کو اپنا بھائی تصوّر کرے اور اخوّت کے حقوق کا خیال رکھے۔ اس سلسلے میں جو کثیر روایات وارد ہوئی ہیں ان میں سے صرف صحیحہ ابی بصیر کو نقل کرتے ہیں:

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۲۶۶۔

المؤمن اخو المؤمن کالجسد الواحد ان اشتکی شیئا منه وجد الم ذالک فی سائر جسدہ و ارواحھما من روح واحد و ان روح المؤمن لاشد اتصالا بروح اللہ من اتصال شعاع الشمس بھا[1]

"مؤمن، مؤمن کا بھائی ہے یہ دونوں ایک بدن کی مانند ہیں جب بھی کسی عضو اور حصے میں درد محسوس ہو اس بدن کے باقی حصے بھی درد محسوس کرتے ہیں۔ ان دونوں کی روحیں بھی ایک روح سے بنی ہوئی ہیں سورج کی شعاعوں اور سورج میں اتنا اتصال نہیں پایا جاتا جتنا اتصال روحِ مؤمن اور روحِ خدا میں پایا جاتا ہے۔"

۲۵۔ مسلمان کے سلام کا جواب دینا واجب اور ابتدائی طور پر سلام کرنا پسندیدہ اور نیک عمل ہے۔

۲۔ کفار سے اخلاقی برتاؤ

۱۔ کفار اور ظالمین پر اعتماد کرنا شرعاً ممنوع اور حرام ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (۱۱: ۱۱۳)

"ظالمین کی طرف نہ جھکو ورنہ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔"

۲۔ کفار اور ظالمین سے محبت اور دوستی شدید طور پر حرام قرار دی گئی ہے۔

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۲۴۴ ۔

قرآن مجید کی متعدد آئیتیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔[1]

۳۔ کفار سے بغض اور عداوت کو حسن قرار دیا گیا ہے اس طرح دینِ اسلام (بلکہ ہر دین) صرف اپنے پروردگار سے محبت کرنے کی تاکید کرتا ہے دوسروں سے نہیں بلکہ کسی حد تک دوسروں کے نزدیک جانے سے بھی منع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ منکرینِ اسلام سے بغض اور دشمنی کو نیک اور اچھا عمل قرار دیتا ہے۔

بنیادی طور پر، اسلام انسانوں کے تکامل (انہیں حد کمال تک پہنچانے) کے لئے آیا ہے اور ایسے لوگوں سے کسی صورت میں بھی سازگار نہیں ہو سکتا، جو اس کی راہ میں رکاوٹ بنیں۔

۴۔ مسلمانوں کی زمام حکومت ظالموں اور کافروں کے سپرد نہیں ہونی چاہیئے اور کفر کے استعمار و استثمار کو اسلامی سرزمینوں میں نابود ہونا چاہیئے۔ قرآن کے اصولوں کے مطابق کفار مسلمانوں کے ولی و سرپرست نہیں ہو سکتے۔ مگر ہماری بدنصیبی ہے کہ دورِ حاضر کی تمام نام نہاد اسلامی حکومتوں کی حالت اس نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ یہ کتنی بد قسمتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ط (۱۳:۱۱)

۵۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی راز ظالمین اور کافرین کو نہ بتائے جائیں یعنی ان میں سے کسی کو بھی اپنا ہم راز نہیں بنانا چاہیئے۔

---

[1] اعتماد و محبت کی صحیح حد بندی اور موضوع و حکم کی وضاحت کے لئے کتاب حدود الشریعہ فی محرماتہا کے جزء اوّل مادہ اخذ و رکون حرف الف و رأ پر ملاحظہ فرمائیں۔

۶۔ زکوٰۃ، خمس اور فطرہ سے ان کی مدد نہیں کی جا سکتی۔

۷۔ ان کے لئے طلب مغفرت جائز نہیں۔

۸۔ مسلمان عورت کی شادی کافر اور کافر عورت (جو اہلِ کتاب نہ ہو) کی شادی مسلمان سے جائز نہیں۔

۹۔ کفار سے جہاد کرنا (جب شرائط پائی جائیں) واجب ہے۔

۱۰۔ کفار سے جو عہد و پیمان کیا جائے وہ واجب الوفا ہے، اس کا نبھانا لازم ہے۔

۱۱۔ کافر کی مہمان نوازی اور اس سے اخلاق سے پیش آنا اس کے انفرادی ظلم سے چشم پوشی کرنا اور اس کی مدد کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ نیک عمل ہے۔

۱۲۔ کفار سے خرید و فروخت اور تجارت سے اگر اسلامی معاشرے کو نقصان نہ پہنچے تو یہ بھی جائز ہے۔

۱۳۔ مغرب و مشرق کی سیاست کو ٹھکرا کر اور مستقل سیاست اپنا کر کافر حکومتوں کی طرف نہ جھکنا ضروری ہے۔

۱۴۔ احکامِ دین کے نفاذ کے سلسلے میں مسلمانوں کو کفار سے نہیں ڈرنا چاہیئے، اور صرف خدا کی ذات سے ڈرنا چاہیئے۔

۱۵۔ کفار کی سی شکل اختیار کرنے کو پسند نہیں کیا گیا بلکہ بہتر ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کے ہم شکل بننے سے احتراز کیا جائے۔

۳- بدکاروں سے اخلاقی سلوک

اس کتاب کے مقدمے میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ انسانی شخصیت کے اہم اسباب اور عوامل میں سے ایک اس کا ماحول اور معاشرہ ہے۔ بنا برایں جہاں تک ہو سکے برُے، گمراہ اور گمراہ کن ساتھیوں سے دور رہنا اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کرنا چاہیئے تاکہ انسان کا اعتقاد اور عمل دونوں تباہی سے دوچار نہ ہوں۔

تا توانی بگریز از یار بد
یار بد بدتر بود از مار بد
مار بد تنہا ترا بر جان زند
یار بد بر جان و ہم ایمان زند

اس سلسلے میں مختلف قسم کی روایات وارد ہوئی ہیں جنہیں مرحوم حر عاملی نے نقل فرمایا ہے[1] جن میں سے بعض یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا:

المرء علیٰ دین خلیلہ۔

"انسان ہمیشہ اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔"

۲۔ شعیب نے امام صادقؑ سے آیۂ کریمہ:

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا. (۴ : ۱۴۰)

---

[1] وسائل، ج ۱۱، ص ۵۰۲ تا ۵۰۹

(یعنی) یہ بات تم پر نازل کی گئی ہے کہ جب تم آیاتِ خدا کا انکار کئے جاتے اور ان کا مذاق اڑاتے، سنو تو اُ کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

اس آیہ شریفہ میں خدا نے ایسے مرد کا ذکر کیا ہے جو حق کا انکار کرے۔ اور پیشواؤں اور قائدوں پر اعتراض کرے۔ ایسے مرد سے دور رہو اور اس کے ساتھ میل جول نہ رکھو۔

۳۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جو خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتا ہو وہ ایسی مجلس و محفل میں کبھی نہیں بیٹھتا جس میں کسی امام کی تنقیص یا کسی مؤمن کی غیبت ہو رہی ہو خداوند کریم کلام پاک میں ارشاد فرما رہا ہے:

وَاِذَا رَأَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْ اٰیَاتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ (۶ : ۶۸)

"ان لوگوں سے جو ہماری آیات (نشانیوں) پر اعتراض کرتے ہیں اس وقت تک دُور رہو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہیں ہو جاتے۔"

۴۔ حضرت سجادؑ نے فرمایا:

تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جس کی چاہو ہمنشینی اختیار کرو کیونکہ خداوند ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا رَأَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْ اٰیَاتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ۔ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ

بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔ (۶ : ۶۸)

(یعنی) اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں بیہودہ بحث کر رہے ہیں تو ان (کے پاس) سے ٹل جاؤ یہاں تک کہ وہ لوگ اس کے سوا کسی اور بات میں بحث کرنے لگیں اور اگر (ہمارا یہ حکم) تمہیں شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ ہرگز نہ بیٹھنا۔

۵۔ امیر المؤمنینؑ سے روایت ہے :

بُروں سے ہمنشینی، اچھوں سے بدبینی و بدگمانی کا باعث بنتی ہے اور اچھے آدمی کی ہمنشینی سے بُرا آدمی بھی اچھا بن جاتا ہے۔

رسولِ اسلامؐ فرماتے ہیں : جو انسان خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ نہ کافر سے برادرانہ تعلقات رکھتا ہے اور نہ فاسق سے میل جول۔

مفسدین و گمراہ کُن لوگوں سے مقابلہ

بُرے لوگوں میں بیٹھنا ہی ممنوع نہیں ہے بلکہ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ان کے فساد اور گمراہی کو روکنے کے لئے اقدام کرے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

میرے بعد تم اہلِ شک اور گنہگاروں کو دیکھو تو ان سے بیزاری (نفرت) اختیار کرو اور انہیں بُرا بھلا کہو، طعنے دو، ان پر بہتان لگاؤ تاکہ اسلام میں فساد پھیلانے کی تمنا ان کے دل سے نکل جائے۔ لوگوں کو ان سے خبردار رکھو تاکہ وہ ان کی بدعتوں سے کوئی چیز نہ سیکھ سکیں۔ اس عمل کے عوض میں

خداوند تمہارے نامہ اعمال میں حسنات اور نیکیاں درج فرمائے گا اور تمہارے درجات بلند فرمائے گا۔[1]

مفسدین اور محاربین (اسلام کے خلاف برسرپیکار لوگوں) کے ساتھ اسلامی حکومت کا برتاؤ اور سلوک سخت ہے جس کا بیان اسلامی فقہ میں موجود ہے۔

بہرحال گمراہ کن، ظالمین اور بدکرداروں کے ساتھ نرمی اور چشم پوشی اختیار نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ یہ نرمی اور دلسوزی نہ صرف نیکی نہیں بلکہ معاشرہ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی اور ظلم ہے اور ان غیر اسلامی حماقتوں اور نادانیوں کی وجہ سے سارے اخلاق اسلامی کو داغدار نہیں کرنا چاہیئے:

ترحم بر پلنگ تیز دندان
ستمگاری بود بر گوسفندان

ایک اہم مطلب جس کی یہاں پر یاد دھانی لازمی ہے وہ یہ ہے کہ غیور مسلمان خصوصاً دانشمندان دین چھوٹے چھوٹے گناہ اور انفرادی مظالم کے سلسلے بہت سخت گیر اور حساس ہیں۔ فوراً اس کا نوٹس لیتے ہیں مگر بڑے بڑے اور اہم اجتماعی گناہوں کو اہمیت نہیں دیتے اور انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ وہ عجیب عمل ہے جس نے اسلام کو بڑی بدبختیوں میں مبتلا کر رکھا ہے مثلاً، بعض اوقات داڑھی منڈھوانے، موسیقی گانا سننے اور اس قسم کی دیگر محرمات کو دیکھ کر طیش میں آجاتے ہیں لیکن اسلامی ممالک کے ظالم

---

[1] وسائل، ج ۱۱، ص ۵۰۸، اس روایت کی سند صحیح اور معتبر ہے۔

و جابر ڈکٹیٹر حکمرانوں اور اسلام دشمن حکومتوں کے مقابلے میں نرمی اور بردباری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ظالم حکومتیں احکامِ دین کو مسخ کر رہی ہیں، خود ساختہ قوانین کو شریعتِ آسمانی کی جگہ مسلمانوں پر لاگو کر رہی ہیں، لوگوں کی آبرو پر تجاوز کر رہی ہیں عفت اور عام اخلاق کو آلودہ کر رہی ہیں، جوانوں کو دین سے منحرف کر رہی ہیں قوم و ملّت کے اموال اور ان کی دولت کو لوٹ رہی ہیں، اور سپر طاقتوں کے استعمار و استثمار کے لئے زمین ہموار کر رہی ہیں۔ کیا ایسے ملعونوں، دھتکارے ہوئے حیوانات سے زیادہ وحشی ظالموں کا مقابلہ ضروری نہیں؟ کیا ان کے مقابلے میں خاموش تماشائی اور غیر جانبدار بنے رہنا گناہ نہیں؟ اس سے بڑھ کر کیا مغربی اور مشرقی طاقتیں امریکہ، روس، چین، فرانس اور برطانیہ نے کمزور اور ستم رسیدہ قوموں کو اسیری و غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑ رکھا؟ کیا وہ ان کی قومی دولت اور اقتصادی سرچشموں کو نہیں لوٹ رہے؟ اور کیا آسمانی اصولوں کے سراسر خلاف اسلامی ممالک کے داخلی معاملات میں ظالمانہ مداخلت نہیں کر رہے ہیں؟ اور کیا اپنے بازاروں کی رونق کے تحفظ کی خاطر ہزاروں مسلمانوں کو تہہ تیغ نہیں کر رہے ہیں؟ کیا ان غیر انسانی اعمال کے مقابلے میں اسلامی اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سکوت اور ذلت اختیار کریں؟ یا یہ کہ سیاسی، فکری اور اقتصادی میدانوں میں اسلامی ممالک کے استقلال اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی حمایت کریں۔ اگر ہمارا جواب سکوت ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ناپاک کمیونسٹوں کی یہ بات مان لی ہے کہ دین ملتوں کے لئے افیون ہے۔

اور اگر ہمارا جواب یہ ہو کہ ظالموں سے مقابلہ کرنا چاہیئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو راضی کر دیا ہے۔

لیکن جاہلوں اور غافلوں کے مقابلے میں ہمارا فرض یہ ہے کہ ان کی راہنمائی کریں اور انہیں سکھائیں نیکیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (۱۰۳ : ۳)

مؤمن کو چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کو حق، صبر اور استقامت کی تاکید اور تلقین کریں۔

۴۔ والدین سے اخلاق

میرے خیال میں والدین کے ساتھ جتنے اچھے برتاؤ کی تاکید اسلام نے کی ہے اتنی کسی اور دین نے نہیں کی۔ درحقیقت والدین کے مقابلے میں انسان کے شرعی فرائض بہت سخت ہیں، راقم الحروف جو پچاس سال کی عمر میں والدین کی نعمت سے مالا مال ہے، ان کی خدمت کے سلسلے میں اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہے۔ عفی اللہ عنہ وعنہما۔

اس مقام پر بعض معتبر نصوص کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ قرآن کی چھ آیتوں میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی اور احسان سے پیش آؤ، بعض آیات میں عباداتِ الٰہی کا حکم دینے اور شرک سے روکنے کے فوراً بعد والدین سے نیکی اور احسان کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ چیز والدین کی اہمیت کی غمازی کرتی ہے۔

۲۔ خالق فرماتا ہے:

اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ (۳۱ : ۱۴)

"میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو"

۳۔ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ.

(اسریٰ : ۲۳)

اگر (والدین) ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں (کہ تیرے لئے باعث زحمت ہوں) تو انہیں اُف (ایسا کلمہ جس سے وہ رنجیدہ ہوں) تک نہ کہنا.

انہیں بلند آواز سے نہ پکارو اور انتہائی عزت و احترام سے ان سے بات کرو، ان کے سامنے تواضع اور مہربانی کا پیکر بنے رہو، انہیں سر آنکھوں پر رکھو اور کہو پالنے والے تو ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا اور میری تربیت کی.

۴۔ وَصَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا. (۳۱ : ۱۵)

دنیا میں والدین سے معاشرت اور اٹھنا بیٹھنا اچھا ہونا چاہیئے اگرچہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں.

۵۔ متعدد روایات کے مطابق عقوق والدین اور ان سے بُرا پیش آنا گناہانِ کبیرہ میں سے ہے.

۶۔ صحیحہ سیف میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو شخص اپنے والدین کو غضب کی نگاہ سے دیکھے اگرچہ انہوں نے اپنے بیٹے پر ظلم کیا ہو، بارگاہِ الٰہی میں اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ (وسائل ج ۱۵ ص ۲۱۷).

۷۔ صحیح حماد میں معصومؑ فرماتے ہیں:

اپنے والدین کو اتنی زحمت بھی نہ دو کہ وہ تم سے اپنی ضرورت کی چیز کا سوال کریں (یعنی والدین کے مطالبے اور حکم سے قبل ہی ان کے لئے ہر چیز آمادہ رکھو) اگرچہ وہ خود مالدار ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر والدین تمہیں رنجیدہ کریں تو یہ نہ کہو کہ آپ نے مجھے رنجیدہ کر دیا ہے اگر وہ تمہیں ماریں تو تم کہو خدا آپ کو بخش دے۔ اپنی آواز اور ہاتھوں کو ان کی آواز اور ہاتھوں سے بلند نہ کرو۔ چلتے وقت ان سے آگے نہ چلو۔[1]

۸۔ والدین کو اذیت دینا اور انہیں رنجیدہ کرنا حرام ہے۔ ہر وہ کام جس سے شفقت کی بنیاد پر اپنی اولاد کو روکیں، اولاد کو چاہیئے کہ وہ فوراً ان کاموں کو ترک کرے اگرچہ وہ کام مستحب بلکہ واجب کفائی ہی کیوں نہ ہوں۔

خلاصہ یہ کہ نیک اخلاق اور خدمت کے ذریعے والدین کی رضا حاصل کرنا اولاد کا اہم ترین فرض ہے فقہی اعتبار سے اس موضوع کی صحیح حدبندی کتاب حدود الشریعہ فی محرماتہا ج ۲ مادہ عقوق میں بیان کی گئی ہے۔ والدین سے بے ادبی کے اثرات اسی دنیا میں اولاد پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اولاد چاہے چھوٹی ہو یا بڑی کا فرض ہے کہ ماں باپ کی اجازت کے بغیر خود ان کے کمرے میں داخل نہ ہو۔ خلوت اور تنہائی کی حالت میں اور ایسے موقعوں پر جب والدین کے عریاں ہونے کا احتمال ہو بغیر اطلاع کے داخل نہ ہوں۔ بلکہ ان سے اجازت لیں اور قرآن کے اخلاقی اصولوں کا خیال رکھیں۔[2]

---

[1] اصول کافی، ج ۳ ص ۲۳۰، کلینی نے مزید ۲۰ روایات نقل کی ہیں۔
[2] سورۂ نور: ۵۸ - ۵۹۔

۵۔ اولاد سے اخلاقی سلوک

اولاد کے حق میں والدین کا سب سے بڑا اور اہم فریضہ اولاد کی صحیح تربیت ہے۔ اولاد کا والدین پر حق ہے کہ وہ انہیں اسلام، دینداری اور اچھے اخلاق کی تربیت دیں۔

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ (۶۶:۶)

اپنے آپ اور اپنی اولاد کو جہنم کی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن پتھر اور انسان ہوں گے۔

اولاد کا نفقہ والدین پر واجب ہے جس کی تفصیل اسلامی فقہ میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ والدین کا نفقہ بھی اولاد پر واجب ہوتا ہے جس کی بحث کا علم اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ بہتر ہے کہ والدین اپنی اولاد کے ساتھ برابر کی مہربانی اور شفقت سے پیش آئیں اور بعض اولاد کو بعض پر ترجیح نہ دیں، جس سے جھگڑے کا خوف ہو۔

اہم بات یہ ہے کہ والدین، لڑکے یا لڑکی کی شخصیت کی تحقیر نہ کریں، انہیں نفسیاتی الجھن میں مبتلا نہ کریں کیونکہ یہ کام ایک قسم کا ظلم بلکہ معاشرے کے ساتھ خیانت ہے۔ اولاد کی محبت کے سلسلے میں والدین افراط و تفریط (انتہا پسندی و کوتاہی) سے اجتناب کریں کیونکہ اس کے آثار بہت برے ہوتے ہیں۔ اولاد کے لئے والدین کی بہترین خدمت، دینداری کے بعد علم و کمال کے حصول کی ترغیب و تشویق ہے۔

۶۔ قریبی رشتہ داروں سے اخلاقی برتاؤ

صلہ رحمی کو منقطع کرنا گناہان کبیرہ میں سے ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ قریبی رشتہ داروں سے رابطہ رکھا جائے اور ان سے پیوند نہ ٹوٹے۔ اگرچہ اس کے لئے مال خرچ کرنا پڑے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے قطع رحمی کے گناہ ہونے پر اس آیہ کریمہ سے استدلال فرمایا ہے:

لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ [1] (۱۳ : ۲۵)

"ان کے لئے لعنت ہے اور ایسے ہی لوگوں کیلئے جہنم ہے۔"

امام محمد باقر علیہ السلام صحیحہ فضیل میں فرماتے ہیں:

"رحم (رشتہ داری) روز محشر عرش الٰہی سے آویزاں ہوگا اور کہہ رہا ہوگا: پالنے والے جو مجھے پیوستہ رکھے اسے پیوستہ رکھ اور جو مجھے منقطع کردے تو اسے منقطع کردے۔"

ایک اور معتبر روایت میں معصومؑ فرماتے ہیں:

صلہ رحم (قریبی رشتہ داروں سے تعلق برقرار رکھنا) عمر دراز کردیتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر انسان کی عمر میں سے صرف تین سال باقی رہ گئے ہوں اور انسان صلہ رحم کرے تو اس سے اس کی عمر ۳۳ سال ہو جاتی ہے، یعنی صلہ رحمی کی وجہ سے مزید تیس سال عمر بڑھ جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ انسان کی عمر میں ۳۳ سال باقی رہ گئے ہوں اور

---

[1] وسائل، ج ۱۱، ص ۲۵۳۔

وہ قطع رحمی کرے تو اس کی عمر تین سال رہ جاتی ہے ۔ اس سلسلے میں روایات زیادہ ہیں[1] یہاں تک کہ قرآن مجید میں ہم پڑھتے ہیں ۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاۗءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ (۴ : ۱)

اور ڈرو جن کے وسیلے سے آپس ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قطع رحم سے بھی (ڈرو) ۔

۷ - ہمسایوں سے اخلاقی روابط

ہمسائے کچھ زیادہ ہی امتیازات وخصوصیات کے حامل ہیں لہٰذا مناسب یہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہمسایوں کی اذیتیں اور تکالیف برداشت کی جائیں اور ان سے اچھا رویہ اختیار کیا جائے ۔

متعدد روایات یہ کہتی ہیں کہ ہمسایوں سے اچھا سلوک عمر کو دراز اور گھروں کو آباد کرتا ہے ۔ کچھ روایات ایسی ہیں جن میں ہمسایوں کو اذیت دینے سے روکا گیا ہے[2]

صحیحہ جمیل میں امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

"ہمسایہ کی حدود ہر طرف سے چالیس گھر ہیں ۔"

البتہ یہ روایت قابلِ بحث ہے ۔ (واللہ اعلم) ۔

۸ - اہلِ علم سے اخلاقی برتاؤ

آیات وروایات سے مجموعی طور پر استفادہ ہوتا ہے کہ علماء اور

---

[1] الوسائل ، ج ۱۱ ، ص ۲۵۳ کے علاوہ اصول کافی ، ج ۳ ، ص ۲۰ ۔ ۳۲ پر مراجع فرمائیں ۔
[2] وسائل ، ج ۸ ، ص ۴۸۷ - ۴۹۱ ۔

معلمین ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور ان کا احترام کرنا چاہیئے۔ استاد شاگرد کے تعلقات احترام و تواضع پر مبنی ہوتے چاہیئں۔

"هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ". (۳۹ : ۹)

"آیا صاحبانِ علم اور جاہل یکساں ہو سکتے ہیں؟"

"يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ" (۵۸ : ۱۱)

اللہ نے مؤمنین اور صاحبانِ علم کے درجات بلند فرمائے ہیں۔"

"اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ" (۳۵ : ۲۸)

"خدا کے بندوں میں سے صرف علماء ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔"

صحیحہ ثمالی میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عالم ینتفع بعلمہ افضل من سبعین الف عابد۔"[1]

"وہ عالم جس کے علم سے استفادہ کیا جائے (یا وہ خود اپنے علم سے استفادہ کرے اور اس پر عمل کرے) ستر ہزار عابدوں سے بہتر ہے۔"

معاویہ بن وہب سے روایتِ معتبرہ میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

علم حاصل کرو اپنے آپ کو حلم اور وقار سے مزین کرو، اور اپنے استادوں اور شاگردوں سے تواضع کے ساتھ پیش آیا کرو۔[2]

لیکن عالم نما مغروروں، جہالت کے تسکار اور فاسق علماء، جو دنیا کی خاطر

---

[1] بحار الانوار، ج ۲، ص ۲۴۔ [2] الوسائل، ج ۱۱، ص ۵۶۸

آخرت کو فراموش کر دیتے ہیں، اور ایسے علماء انقلاب اسلامی میں آزمائے گئے ہیں۔ ان سے اجتناب کرنا چاہیئے اور سادہ لوح مسلمانوں کو ان کے ناپاک عزائم سے آگاہ رکھنا چاہیئے۔

۹۔ بزرگوں سے اخلاقی برتاؤ

سن رسیدہ اور بوڑھے افراد بھی خاص احترام کے مستحق ہیں، امام صادق علیہ السلام صحیحہ ابن سنان میں فرماتے ہیں

"ان من اجلال اللہ عز و جل اجلال الشیخ الکبیر"

"بوڑھے آدمی کا عزت و احترام خدا کا احترام ہے"

اس مضمون کی کچھ روایات اور بھی ہیں[1]

بعید نہیں روایات میں بزرگوں سے مراد مسلمان بزرگ ہوں۔

۱۰۔ مرد اور عورت کے درمیان اخلاقی روابط

اگر مرد اور عورت زوجیت کے رشتے میں منسلک نہ ہوں تو ان کے تعلقات ایسے نہیں ہونے چاہئیں جن سے جنسی جذبات بھڑک اٹھیں اور دورانِ گفتگو عورت کی آواز اتنی نرم اور دلربا نہیں ہونی چاہیئے جس سے شہوت پرست مرد طمع اور لالچ میں پڑ جائے۔

فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض۔ (الاحزاب: ۳۲)

---

[1] وسائل، ج ۸، ص ۴۶۶۔

(اجنبی آدمی سے) بات کرنے میں نرم نرم (لگی لپٹی) بات نہ کرو تاکہ جس کے دل میں (شہوت، زنا) مرض ہے وہ (کچھ اور) آرزو نہ کرے۔

اگر عورت کی عفت (پاکدامنی) اور اسلامی حجاب محفوظ رہے تو اجتماعی اور سیاسی فرائض اور اقتصادی کاروبار میں اس کی شرکت ممنوع نہیں۔ جو حضرات خواتین کی خانہ نشینی کے حق میں ہیں، اگر وہ باہر کے کاموں میں مردوں کے ساتھ عورت کی شرکت کو حرام قرار دیتے ہیں تو ان کی یہ بات بے دلیل ہے، اور اگر اسے حرام قرار نہیں دیتے بلکہ احتیاط اور تقویٰ کے خلاف سمجھتے ہیں تو انہیں متوجہ ہونا چاہیئے کہ دورِ حاضر میں عورتوں اور لڑکیوں کا گھروں میں بیٹھے رہنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ جب ان کے لئے دروازے بند کر دیں اور انہیں جائز فعالیت اور کارکردگی کی اجازت نہ دیں گے تو بیگانوں کے ایجنٹ انہیں بازار تک ہی نہیں نکال لائیں گے بلکہ فلموں، رقاص خانوں اور گمراہی کے مراکز میں ان کے دین، عفت اور اخلاق کو لوٹ لیں گے اور آخر کار "تمدن"، گھر کی قید اور رجعت پسندی سے فرار کے بہانے مسلمان عورتوں کو لہو و لعب اور شہوت کے کھلونے بنا دیں گے۔ یوں پورا گھرانہ تباہ ہو جائے گا، فحاشی اور فسق و فجور عام ہو جائیگا، بچے اسلامی تربیت سے محروم ہو جائیں گے اور آخر کار دنیائے کفر میں رائج بے قید و شرط آزادی جو خشک مقدس متعصبوں کی سختیوں کا لازمہ ہے، اسلامی معاشرے کی ہیبت و وقار کو کافی حد تک تباہ کر دے گی۔ بنا برایں سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اپنی خواتین کو معقول اور اسلامی آزادی دیں۔

عورت اپنے چہرے کو کھلا چھوڑ سکتی ہے عورت کو علوم دینی اور

سائنسی علوم کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔ عورت ورزش کا حق رکھتی ہے اور معاشرے میں اپنی جسمانی اور نفسیاتی خصوصیات کے مطابق کوئی نہ کوئی منصب سنبھال سکتی ہے۔ مسلمان عورت کو چاہیئے کہ وہ اپنی شخصیت اور اسلامی و اخلاقی وقار کو گھر میں بھی اور معاشرے میں بھی برقرار رکھے اور اپنے روشن و درخشاں گزشتہ اسلامی ادوار کا سہارا لے۔

ہاں! تو نہ ہم عورت کی اسیری کے قائل ہیں اور نہ اس کی جہالت کے (کہ وہ جاہل رہے) نہ اس کے لئے حقارت کے قائل ہیں نہ اسے شہوت کا کھلونا بنانے کے، نہ اس بات کے قائل ہیں کہ وہ اپنی زنانہ طبیعت سے بالکل بیگانہ رہے، بلکہ اس کی آزادی، عزت و شرف شخصیت اور معرفت کے قائل ہیں۔

عورت اپنے لئے شوہر کے انتخاب کا حق رکھتی ہے اور اس کو اس حساس مسئلے میں کوئی بھی مجبور نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر لڑکی کنواری ہو تو باپ یا دادا کے تجربات سے استفادہ کرنا (ان کی اجازت) لازمی ہے اور اگر باپ اور دادا دونوں ناداں ہوں اور کسی صورت میں بھی راضی نہ ہوں تو ان کی اجازت ساقط ہو جاتی ہے اور لڑکی ان کی اجازت کے بغیر شوہر کا انتخاب کر سکتی ہے۔

جہاں تک ممکن ہو مرد ایک سے زیادہ شادیوں سے احتراز کرے۔ کیونکہ زیادہ شادیوں کے بعد موجودہ حالات میں اخلاقی، نفسیاتی، اقتصادی اور اجتماعی نقصانات سے بچنا بہت مشکل ہے، اس کے علاوہ ایسی صورت میں مرد اپنے فکری سکون سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، لیکن اگر مرد یہ فیصلہ کر لے کہ دوسری شادی کرنا ہے تو پہلی بیوی کو اس کی مخالفت

اور اس میں مزاحمت نہیں کرنا چاہیئے اور اسے چاہیئے کہ وہ اپنے احساسات و جذبات کو عقل کے ذریعے کنٹرول میں رکھے۔

شوہر و زوجہ کے درمیان اخلاقی نزاکتوں کا خیال رکھا جانا چاہیئے اور ایک دوسرے سے محبت ہونی چاہیئے تاکہ آپس کی غلطیوں کو آسانی سے نظر انداز کر سکیں۔ عورت اپنے شوہر کے علاوہ دوسرے مردوں سے ناجائز تعلقات استوار نہ کرے اور نہ مرد دوسری عورتوں سے ایسے تعلقات استوار کرے۔

مرد کو اپنی بیوی کی عفت اور پاک دامنی کے تحفظ میں حدِ اعتدال سے خارج نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اس سلسلے میں کوتاہی برتنے سے بعض اوقات مرد بے غیرت اور عورت فاحشہ بن جاتی ہے، یہ بات مغربی آزادی بلکہ دنیائے کفر کی آزادی میں تجربے سے ثابت ہو چکی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص سے جو کسی جگہ سے آنحضرتؐ کے گھر یا کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا فرمایا:

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرے پہنچنے تک تم وہیں رہو گے تو آکر تمہاری آنکھ پھوڑ دیتا۔"

ایک اور صحیح روایت میں رسولِ اکرم صلعم نے فرمایا:

میرے بابا ابراہیمؑ غیور انسان تھے اور میری غیرت ان سے بھی زیادہ ہے۔ خدا بے غیرت مؤمن کی ناک خاکِ ذلت میں رگڑے[1]

---

[1] وسائل، ج ۱۴، ص ۱۰۹۔

عفت کے تحفظ میں افراط اور انتہاء پسندی کے نتیجے میں شوہر اور بیوی دونوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور سوءظن اور ایذا رسانی جیسے گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے۔ جو مرد اپنی عورتوں کو قریبی رشتہ داروں اور سہیلیوں کے ہاں آنے جانے اور ان سے گفتگو کرنے سے روکتے ہیں، اچھا کام نہیں کرتے، اور فرمانِ الٰہی "وعاشروھن بالمعروف" یعنی "خواتین کو نیک اور اچھی زندگی گزارنے کا حق دو" سے اچھا استفادہ نہیں کرتے۔

مرد گھر کے سرپرست کی حیثیت سے عورت کی نظر میں کسی حد تک محترم ہونا چاہیئے، اور عورت چونکہ مزاج اور جسمانی اعتبار سے کمزور ہے اسلیئے مرد کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ لڑکی لڑکے سے کم نہیں اسلیئے والدین کو چاہیئے کہ وہ لڑکی کے ساتھ سرد مہری اور بے رحمی سے پیش نہ آئیں اور اسے حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیں، یہ زمانہ جاہلیت کا شیوہ ہے۔

راقم الحروف نے عورت اور اس کے حقوق سے متعلق "ہمارے نقطۂ ہائے نگاہ اور مؤقف" کے نام سے ایک مستقل کتاب میں بحث کی ہے اس لیئے اس کا ذکر دوبارہ نہیں کرتا۔

۱۰۔ حکومت اور عوام کے درمیان اخلاقی روابط

یہ ایسا موضوع ہے جو مستقل کتاب کا محتاج ہے، توفیق ایزدی شامل رہی تو سیر حاصل بحث کی جائے گی، حکومت اور عوام کا بہترین رابطہ یہ ہے کہ عوام حکومت پر چھائے ہوئے ہوں اور ایک مسلم و صحیح قانون عوام (ملت)

پر حاکم ہو۔ فرعون نے اپنی ملت کو حقیر سمجھا اور ملت نے اس کے استبداد اور مظالم کا مقابلہ نہ کیا اور نہ ان کا سدباب کیا، بلکہ اس کے مظالم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اس کے غلط نظام کو تسلیم کر لیا، اسی لئے خداوند عالم نے اس قوم کو ذلیل ستم کش اور فاسق کے نام سے یاد کیا

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَاَطَاعُوْهُ ط اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فَاسِقِيْنَ.

"غرض فرعون نے (باتیں بنا کر) اپنی قوم کی عقل ماردی اور وہ لوگ اس (۴۳ : ۵۴) کے تابعدار رہیں گے بے شک وہ لوگ بدکار ہی تھے"

اور اگر حاکم وقت شرعی شرائط کا حامل ہو تو لوگوں کو چاہیئے کہ وہ عام اسلامی احکام کے دائرے میں اس کی اطاعت کریں اور اگر وہ زبردستی حکومت کرنا چاہے تو ایسے حاکم میں حکومت کرنے کی ایک اہم شرط مفقود ہے جس سے وہ خود بخود معزول ہو جاتا ہے، اور وہ اہم شرط عدالت ہے۔

اختتامیہ

۱۔ اخلاقی آیات

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ط
وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْٓءً فَلَا مَرَدَّ لَہٗ ۔ (۱۳ : ۱۱)

خداوند اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی خامیاں دُور نہ کرے ۔

جس چیز کی تبدیلی خود لوگوں کے ہاتھ میں ہے ۔ اس سے مراد لوگوں کا طرزِ تفکر، اخلاقی صفات اور ان کے افعال ، تینوں چیزیں ہیں یا ان میں سے بعض ؟

بعید نہیں کہ ان سے مراد اوّل و دوم (طرزِ تفکر اور اخلاقی صفات) ہوں، بنا بریں انسانی اخلاق اس کی تمام بدبختیوں اور خوش بختیوں کی بنیاد قرار پاتا ہے ۔ اگرچہ ان خوش بختیوں اور بدبختیوں کے بعض دوسرے اسباب بھی ہو سکتے ہیں جو ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، بہرحال یہ مسلّم ہے کہ

یہ آیۂ کریمہ انسان کی عمومی اور اجتماعی زندگی میں اس کے اخلاقی کردار پر دلالت کرتی ہے مگر آیۂ کریمہ سے یہ سمجھنا بعید نہیں کہ انسان کے انفرادی حالات بھی اس کی نفسیات کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ انسانی حالات خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے دو طرح کے ہوا کرتے ہیں۔

(i) **انفرادی حالات:** جو کہ فرد کے اخلاق اور اس کے طرز تفکّر کے تابع ہوتی ہے۔

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵:۱۰۵)

تم اپنے نفسوں کا خیال رکھو (انہیں بچاؤ) اگر تم خود ہدایت یافتہ ہو تو دوسروں کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

(ii) **عام اور قومی حالات:** جو کہ عمومی اور اجتماعی اخلاق کے تابع ہوتے ہیں، انفرادی اخلاق اور طرزِ تفکر، عام حالات میں کوئی دخل نہیں رکھتے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۸:۲۵)

یعنی اس فتنے سے ڈرو جو صرف ظالمین پر ہی نازل نہیں ہوگا بلکہ صالحین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

دونوں آیات میں غور کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ انفرادی حالات کی حیثیت، اجتماعی حالات سے مختلف ہے۔

اس بیان سے انسان کی انفرادی زندگی میں امر بہ معروف اور نہی از منکر اور دوسروں کی راہنمائی کی تاثیر کا راز بھی واضح ہو جاتا ہے

جس طرح ہمارے بچے لاپرواہ ہمسایوں کی گندگی سے پیدا ہونے والے جراثیموں سے محفوظ نہیں رہ سکتے، اسی طرح وہ ان کے غلط اور آلودہ اخلاق سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہم نے گھر میں اولاد کو اچھا اخلاق سکھایا ہو لیکن جب تک پورے معاشرے اور ماحول کی اصلاح نہ ہو، افراد کی اصلاح گو ممکن ہے، محال نہیں مگر دشوار اور مشکل ضرور ہے

۲۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا .... الخ (۱۶: ۱۲۶ تا ۱۲۸)

"اگر انتقام لینا چاہو تو جتنی تم پر زیادتی ہوئی ہے اس کے مطابق انتقام لو، اور اگر صبر کرو تو یہ (صبر کرنا) صابرین کے لئے بہتر ہے، اے میرے رسولؐ اپنی امت کی رنجش اور مشقت پر صبر کرو اور ضدی کفار کے عناد (دشمنی) سے رنجیدہ خاطر نہ ہو، ان کے مکروفریب کی وجہ سے اپنے آپ کو سختی میں مبتلا نہ کرو۔ اس لئے کہ خدا متقی اور نیک لوگوں کے ساتھ ہے۔"

۳۔ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا .... الخ (۱۷: ۳۷)

"روئے زمین پر اکڑ کر نہ چلا کرو نہ تو تم زمین کو چیر سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی چوٹی تک تمہاری رسائی ہو سکتی ہے۔"

۴۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ... الخ (۲۳: ۱)

"وہ مومنین کامیاب ہیں جو خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور وہ لوگ جو لہو ولعب سے پہلو تہی کرتے ہیں اور وہ لوگ جو زکوٰۃ دیتے ہیں اور اپنی عورتوں کے علاوہ دوسروں سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو امانتوں اور عہد و پیمان کا خیال رکھتے

ہیں اور اپنی نمازوں کی حفاظت اور پابندی کرتے ہیں"۔

۵۔ لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ ... الخ (۴۹ : ۱)

"اے صاحبانِ ایمان! کسی کام میں بھی خدا اور رسول پر سبقت نہ لے جاؤ اور اپنی آوازیں رسول کی آواز سے زیادہ بلند نہ کرو، اور نہ رسول سے بآواز بلند ہمکلام ہوا کرو"۔

۶۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ... الخ (۴۹ : ۱۰)

"صرف صاحبان ایمان ہی ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اپنے بھائیوں میں مصالحت کراؤ۔

کوئی قوم کسی دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے ہو سکتا ہے وہ (دوسری) قوم مذاق اڑانے والی (قوم) سے بہتر ہو۔

ایک دوسرے کی عیب جوئی نہ کرو اور برے القاب سے ایک دوسرے کو نہ پکارو۔

بہت سارے گمانوں سے اجتناب کرو اس لئے کہ بعض گمان گناہ ہیں۔

لوگوں کے ذاتی کاموں میں تجسس نہ کرو (کھوج نہ لگاؤ)

ایک دوسرے کی غیبت سے پرہیز کرو۔ اور (غیبت سے) دور رہو کیا تم میں سے کوئی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کریگا؟ (نہیں تمہیں اس سے کراہت ہے)"۔

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے مختلف قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے سے متعارف رہو، تم میں سب سے

زیادہ باعزت اور محترم وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔"

۷۔ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۔ الحج (۱۰۴ : ۱)

"ویل اور افسوس ہر عیب جو اور طعنے دینے والے پر جو مال و دولت جمع کرتا ہے اور اس کا حساب کرتا رہتا ہے اور اسی سے دِل لگائے رہتا ہے۔"

۸۔ کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو دین کی تکذیب کرتا ہے اور یتیم کو جھڑک کر بھگا دیتا ہے، مسکینوں، بے چاروں اور ناداروں کو کھانا کھلانے کی ترغیب و تشویق نہیں کرتا۔ ویل ہو ان لوگوں پر جو چھوٹے چھوٹے کارِ خیر سے بھی روکتے ہیں۔"

۹۔ "اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف جلدی کرو۔ اسے جلدی حاصل کرو اور اس جنت کی طرف جلدی کرو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور پرہیزگاروں کے لئے بنائی گئی ہے جو کہ آسودگی اور سختی دونوں حالتوں میں راہِ خدا میں انفاق کرتے ہیں اور غصے کو پی جاتے ہیں۔"

۱۰۔ سست اور غمگین نہ ہو، اگر صاحب ایمان ہو تو برتری اور بالادستی تم کو حاصل ہے۔ اگر جنگوں میں تمہیں کوئی گزند پہنچے ایسا تمہارے دشمنوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ ہم ان ایام کو کبھی فتح و نصرت کے ساتھ اور کبھی شکست کے ساتھ لوگوں میں گھماتے رہتے ہیں۔

خدا ظالموں کو نہیں چاہتا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں پہلے جاؤ گے ایسی حالت میں کہ تم میں سے مجاہدین اور صابرین معین نہ ہوں۔"

۱۱۔ مؤمنین کامل وہ لوگ ہیں کہ جب خدا کو یاد کیا جاتا ہے تو ان کے دل دھڑکتے ہیں اور جب قرآنی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کا ایمان

بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر توکّل (بھروسہ) کرتے ہیں۔"

۱۲۔ خدا کی عبادت کرو اور کسی اور کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، بیچاروں، رشتہ دار ہمسایوں، اجنبی ہمسایوں قریبی ہمنشینوں، ابن سبیل (جس کا سفر خرچ ختم ہو گیا ہو) اور غلاموں سے نیکی اور احسان کرو۔

خداوند کسی بھی متکبر، خود بین کو جو خود بھی بخل کرتا ہے اور دوسروں کو بھی بخل کا حکم دیتا ہے، نہیں چاہتا۔

۱۳۔ خداوند تمہیں تین چیزوں کا حکم دیتا ہے، عدل، احسان اور قریبیوں سے نیکی اور احسان اور تین چیزوں سے روکتا ہے، بُرے کام (گناہ) فحاشی اور ظلم۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔ (۱۶:۹۰)

راغب اپنی مفردات میں منکر کی یوں تعریف کرتے ہیں، منکر ہر اس فعل کو کہا جاتا ہے جسے عقلِ سلیم قبیح اور بُرا سمجھے یا وہ چیز ہے جس کے حسن و قبح تک عقل کی رسائی نہ ہو مگر شریعت اسے قبیح قرار دے اور فحشاء، فحش اور فاحشہ کی تعریف میں لکھا ہے، ہر وہ قول و فعل جس کی قباحت بہت زیادہ ہو۔ ما عظم قبحہ من الافعال والاقوال۔

مسلم ہے کہ زنا، لواطہ، مساحقہ اور اس قسم کے کام، فحشاء میں شمار ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ظہار کو (شوہر بیوی سے کہے تیری پشت میری والدہ کی پشت جیسی ہے) منکر اور جھوٹ قرار دیا گیا ہے۔

بنا برایں گالی گلوچ رکیک اور گھٹیا قسم کے الفاظ، اموال کو غصب کرنا، امانت میں خیانت کرنا اور عہد و پیمان کی مخالفت کرنا منکرات میں سے ہیں اور وعدہ وفا کرنا، کسی کافر کو جو امن طلب کرے پناہ دینا ان سب چیزوں کو اسلامی فقہ میں واجب قرار دیا گیا ہے۔

بنیادی طور پر علم اخلاق اور علم فقہ کا باہمی تعلق اور رشتہ بہت مضبوط اور پیچیدہ ہے اور ان دونوں (اخلاق اور فقہ) کی تفصیل اور دقیق تمیز دینا آسان اور معمولی کام نہیں۔

۲۔ بعض اخلاقی روایات

امام جعفر صادق علیہ السلام صحیحہ عبداللہ بن غالب میں فرماتے ہیں:
مؤمن کو آٹھ صفات کا حامل ہونا چاہیئے:

۱۔ وقورٌ عند الهزاهز — ہلا دینے والی مشکلات میں بھی نہ ڈگمگائے، باوقار رہے۔

۲۔ صبورٌ عند البلاء — مصائب میں ثابت قدم رہے۔

۳۔ شکورٌ عند الرخاء — آسودہ حالی میں شکر گزار رہے۔

۴۔ قانع بما رزقه الله — جو کچھ خدا نے اسے دے رکھا ہے اس پہ اکتفا کرے۔

۵۔ لا یظلم الاعداء — دشمنوں پر ظلم نہ کرے۔

۶۔ ولا یتحامل للاصدقاء — دوستوں کے لئے ایسے کام کی ذمہ داری نہ لے جسے نبھا نہیں سکتا۔

۷۔ بدنه منه فی تعب — ہر وقت جسمانی محنت میں مصروف رہے۔

۸۔ والناس منه فی راحة — لوگ اس کی طرف سے امن و سکون سے رہیں۔

ان العلم خلیل المؤمن والحلم وزیره والصبر امیر جنوده والرفق اخوه واللین والده۔[1]

"علم مؤمن کا دوست، حلم اس کا وزیر، صبر اس کا امیر لشکر، بردباری اس کا بھائی اور نرمی اس کا والد ہے۔"

یہی جملے حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام سے بھی منقول ہیں۔

صحیحہ جابر میں حضرت امیرالمؤمنین ؑ اور حضرت امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدا نے ایمان کی چار بنیادیں قرار دی ہیں:

۱۔ صبر۔ ۲۔ یقین۔ ۳۔ عدل۔ ۴۔ جہاد۔

صبر کے چار شعبے ہیں۔ شوق، خوف، زھد، انتظار۔

جس شخص کو بہشت کا شوق ہو وہ خواہشات نفسانی کی پیروی نہیں کرتا۔ جسے آتش جہنم کا خوف ہو حرام کام انجام نہیں دیتا۔ جو شخص دنیا میں پرہیزگار ہو اس پر مصیبتیں آسان ہو جاتی ہیں جسے موت کا انتظار ہو نیکیوں کی طرف تیزی سے بڑھتا ہے۔

یقین کے بھی چار شعبے ہیں:

۱۔ ہوشیاری و دُور اندیشی۔ ۲۔ حکمت تک رسائی۔ ۳۔ معرفت و عبرت۔ ۴۔ گذشتہ لوگوں کی سنّت۔

فمن ابصر الفطنة عرف الحکمة ومن تأوّل الحکمة

---

[1] اصول کافی، ج ۳، ص ۳۲۶

عرف العبرة ومن عرف العبرة عرف السنّة ومن عرف السنّة فكانّما مع الاوّلين۔

"جو شخص فطین و ہوشیار ہو وہ حکمت کو سمجھ لیتا ہے اور جو شخص حکمت کی تاویل کر سکتا ہے وہ عبرت کو سمجھ لیتا اور جس نے عبرت کو سمجھ لیا اس نے سُنّت کو سمجھ لیا اور جس نے سُنّت کو سمجھا گویا وہ اوّلین کے ساتھ ہے۔"

محکم اور مضبوط راستے کی راہنمائی حاصل کرے اور یہ دیکھے کہ جسے نجات ملی ہے اسے کیونکر نجات ملی ہے اور جو ہلاک ہوا ہے وہ کیونکر ہلاک ہوا ہے۔ دیکھو جسے بھی خدا نے تباہ کیا ہے اسے اس کے گناہوں کی پاداش میں تباہ کیا ہے اور جسے نجات دی ہے اس کی اطاعت کی وجہ سے دی ہے۔

عدالت کے بھی چار شعبے ہیں۔ ۱۔مشکل مسائل کو سمجھنا۔ ۲۔علم کی گہرائیوں تک پہنچنا۔ ۳۔فیصلوں کا واضح ہونا۔ ۴۔حلم و بردباری۔

جس نے مسائل کو سمجھا اس نے علم کی تفسیر کی اور جس نے علم حاصل کیا اس نے فیصلے کرنے کی راہوں کو جان لیا اور جو شخص بردبار ہو وہ اپنے کاموں میں حد سے تجاوز نہیں کرتا۔ لوگوں میں اچھی اور قابلِ تعریف زندگی گزارتا ہے۔

جہاد کے بھی چار شعبے ہیں: ۱۔امر بمعروف۔ ۲۔نہی از منکر۔ ۳۔ہمیشہ سچ بولنا۔ ۴۔فاسقین سے دشمنی۔

جو شخص امر بمعروف کرے گویا اس نے مؤمن کی کمر مضبوط کی ہے، اور جس نے نہی از منکر کیا اس نے منافق کو ذلیل و خوار کر دیا اور اس کے

مکر و فریب سے امان میں رہا، جو شخص ہمیشہ سچ بولے اس نے اپنا فرض ادا کر دیا اور جس نے بدکاروں و گناہگاروں سے دشمنی کی اس کی یہ دشمنی خدا کی خاطر ہے اور جو شخص خدا کے لئے کسی سے دشمنی کرے تو خدا بھی اس کی خاطر غضبناک ہو جاتا ہے پس یہ ہے ایمان، اس کے ارکان اور شعبے۔[1]

۳۔ اخلاقی داستانیں

۱۔ حذیفہ کہتے ہیں، میرا چچا زاد بھائی جنگ یرموک میں زخمی ہو گیا میں پانی کا ایک گلاس لے کر اس کے پاس گیا اور اسے کہا۔ پانی پیو گے؟ زخمی نے اشارے سے اثبات میں جواب دیا، اسی دوران ایک اور زخمی ہشام بن عاص نے اشارے کے ذریعے اپنی پیاس کا اظہار کیا، میرے چچا زاد بھائی نے مجھے کہا کہ پانی ہشام کو دے دو۔ اس طرح اس نے ہشام کو اپنے نفس پر ترجیح دی۔ حذیفہ کہتے ہیں جونہی میں پانی لے کر اس زخمی کے پاس گیا، اسی دوران ایک تیسرے زخمی کی آواز سنائی دی جو پانی مانگ رہا تھا، ہشام نے مجھ سے کہا کہ پانی تیسرے زخمی کو دے دو، جب میں نے تیسرے زخمی کے پاس جا کر دیکھا تو وہ اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر چکا تھا، جب لوٹ کر دوسرے کے پاس آیا تو وہ بھی داعی اجل کو لبیک کہہ چکا تھا، اور جب سب سے آخر میں اپنے چچا زاد بھائی

---

[1] اصول کافی مترجم، ج ۳، ص ۸۳۔۸۴۔

کے پاس گیا تو وہ بھی خالقِ حقیقی سے جا ملا تھا۔

یہ ہے بلند انسانی اخلاق میں دین کی تاثیر اور کردار! کہ زندگی کے آخری لمحات میں بھی دوسروں کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں۔

وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (۵۹:۹)

اور اگرچہ اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں۔

۲۔ مجاہدین بتاتے ہیں کہ ہمارے وطنِ عزیز (افغانستان) کے مجاہدین میں سے ایک جانباز سپاہی محاذِ جنگ سے گھر واپس آیا اور دیکھا کہ اس کی بیوی پریشان حال ہے۔ مجاہد نے پریشانی کا سبب دریافت کیا۔ بیوی نے جواب دیا کہ آج تیسرا دن ہے کہ روٹی میسر نہیں ہے ہیں اور بچے گھاس و پتوں پر گزارا کر رہے ہیں۔ مرد انتہائی پریشانی کے عالم میں گھر سے نکلا اور تقریباً نو کلو گندم خرید کر گھر لے آیا اور اسے بیوی کے سپرد کیا تاکہ دستی چکی میں پیس کر اس کا آٹا بنایا جائے۔ لیکن اس ماجرے کو دیکھ کر اس کی بیوی اور زیادہ خفا ہو گئی اور شوہر پہ اعتراض کیا کہ یہ پیسے گندم پر کیوں لگا دیئے؟ مجاہد نے جواب دیا: کیا تم نے یہ شکایت نہیں کی کہ ہمیں تین دن سے کھانے کو کچھ نہیں ملا؟ بیوی نے جواب دیا: ٹھیک ہے، لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ فوراً جا کر گندم خرید لو، ہم آئندہ بھی گھاس، پتے وغیرہ کھا کر گزر اوقات کر سکتے تھے بہتر تو یہ تھا کہ گندم کی قیمت سے گولیاں خریدی جاتیں اور ان سے دشمنانِ خدا (پلید روسی اور ان کے داخلی ایجنٹوں) کے سینے چھلنی کئے جاتے۔

یہ ہے ایک مسلمان انقلابی خاتون۔ یہ ہے ایک دخترِ زینب سلام اللہ علیہا۔

وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ۔ (۳: ۳۶)

۳۔ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کے داماد اور بھتیجے جناب عبداللہ بن جعفر نے ایک سیاہ غلام کو دیکھا کہ وہ اپنے کھانے کے لئے تین عدد روٹیاں رکھے ہوئے تھا، اتنے میں ایک کتا باغ میں داخل ہوا اور اس غلام کے نزدیک آیا، غلام نے ان روٹیوں میں سے ایک روٹی کتے کو دے دی چونکہ کتا بھوکا تھا، فوراً روٹی کھا گیا، جب غلام کو اس کا علم ہوا تو دوسری روٹی بھی کتے کو دے دی، مگر کتا اتنا بھوکا تھا کہ دوسری روٹی نگلنے کے بعد غلام کی طرف تکنے لگا۔ غلام نے تیسری روٹی بھی کتے کے حوالے کر دی اور اپنا دسترخوان سمیٹنے لگا۔ عبداللہ بن جعفر (جو اس منظر کو دیکھ رہے تھے) آگے بڑھے اور غلام سے پوچھا تمہارے کھانے کے لئے کچھ بچا ہے؟ غلام نے جواب دیا یہی تین روٹیاں تھیں جو کتے کو کھلا دیں، اب آج کا دن بھوکا ہی رہنا پڑے گا۔ عبداللہ بن جعفر نے پوچھا: تو نے کتے کو اپنے نفس پر کیوں ترجیح دی، غلام نے جواب دیا: ہمارے گاؤں میں کوئی کتا نہیں، معلوم ہوتا ہے یہ کتا دور سے آیا ہے اور سخت بھوکا ہے مجھ پر یہ بات بہت گراں گزری کہ میں اس کتے کو محروم رکھتا اور اسے کچھ نہ دیتا، عبداللہ بن جعفر نے جو غلام کی جوانمردی سے بہت متاثر تھے وہ باغ اور غلام دونوں مالک سے خرید ے اور غلام کو آزاد کر کے باغ اسے بخش دیا۔

۴۔ ایک مسلمان دوشیزہ سے جس کے رشتے کی خواستگاری ہو رہی تھی میں نے کہا، تم شادی نہیں کرو گی؟ اس نے کہا: نہیں، جب تک افغانستان کا اسلامی جہاد کامیاب نہیں ہو جاتا اس وقت تک شادی نہیں کروں گی۔ اس مسلمان لڑکی نے فقیر ہونے کے باوجود اپنے فقر کا اظہار نہ کیا اور راقم الحروف سے کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ اصرار کر رہی تھی کہ مجھے رائفل دی جائے تاکہ افغانستان جا کر کمیونسٹوں کو ختم کر سکوں، آخر کار خالی ہاتھ افغانستان گئی اور فی الحال وطن عزیز کے خون میں ڈوبے ہوئے تیسرے شہر میں مصروفِ جہاد ہے۔

راقم الحروف کے متعلقین میں سے ایک خاتون نے (جس کی رشتہ داری کا مصلحت کے تحت ذکر نہیں کرتا) مجھ سے کہا: میری لڑکی کے زیورات کھو گئے تھے۔ مجھے گمان یہ تھا کہ یہ زیورات ہماری نوکرانی نے چرائے ہوں گے، چنانچہ میں اس کے گھر گئی اور آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی جیب میں ڈالا اور کہا کہ شاید تم نے غلطی سے بچی کے زیورات جیب میں ڈال لئے ہوں، اس نے انکار تو کیا لیکن زیورات اس کی جیب میں موجود تھے، میں نے جلدی سے زیورات اٹھا کر چھپا لئے اور کہا کہ سچ ہے تمہاری جیب میں زیورات نہیں ہیں، اس کے بعد میں واپس اپنے گھر چلی آئی۔

میں نے اس خاتون سے پوچھا:

آخر آپ نے زیورات اس کی جیب سے نکالنے کے بعد اس نوکرانی کو کیوں نہیں دکھائے؟

خاتون نے جواب دیا:

اگر میں اسے دکھاتی تو اسے خجالت ہوتی، وہ مجھ سے شرمندہ ہوتی اور میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے شرمندہ ہو۔

۶۔ مشہور علماء قم میں سے ایک عالم کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ اس نے علم رجال کی ایک کتاب لکھی تھی اور اسے چھاپنا چاہتا تھا اسی دوران مرحوم اردبیلی کی کتاب "جامع الرواۃ" اس عالم کی نظر سے گزری فرمایا کہ یہ کتاب میری کتاب سے بہتر ہے، پھر اپنی کتاب کی بجائے اردبیلی مرحوم کی کتاب چھپوا دی۔

۷۔ ایک افغانی جوان "زاہدان" اور "تفتان" کے راستے افغانستان کے محاذ پر جا رہا تھا، "تفتان" پہنچنے پر اس کی اپنے والد یا بعض رشتہ داروں سے ملاقات ہوئی جو افغانستان سے اس کی منگیتر کو اپنے ساتھ لائے تھے تاکہ ایران میں ان کی شادی کر دی جائے، اس جوان سال سے کہا گیا کہ واپس گھر چلے اور شادی کرے۔ اس جوان نے کہا: نہیں میں محاذ پر جا رہا ہوں۔

رشتہ داروں نے اصرار کیا، مگر یہ اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا، آخر کار رشتہ داروں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک ہفتہ کے لئے وہ زاہدان ٹھہر جائے اور شادی کی تقریبات انجام دے کر محاذ پر چلا جائے اور ہم تمہاری بیوی کو لے کر مشہد چلے جائیں گے اس جوان نے اس سے بھی انکار کیا اور جواب دیا کہ وہ ایک ہفتہ کے لئے بھی نہیں رک سکتا، ایک ہفتہ بھی زیادہ ہے آخر کار یہ نوجوان اپنے ساتھیوں سمیت محاذ کی طرف روانہ ہوگیا، اور اس کی منگیتر کو اس کے رشتہ دار ایران لے گئے۔

۸۔ ایک مسلمان نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھ راہِ خدا میں کلائی سے کٹوا

دیئے تھے، ایک دن اسی نوجوان کو حرکت اسلامی کے نمائندہ دفتر میں دیکھا جو با حوصلہ نظر آرہا تھا۔ دوسری دفعہ اس نوجوان کی ملاقات کے لئے گیا اور دیکھا کہ اس کے پاس ایک خاتون ہے جو اس سے ہمکلام ہے، جسے دیکھ کر میں واپس آگیا اور دفتر کے آدمی سے پوچھا: اس خاتون کا نوجوان سے کیا رشتہ ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ رشتہ تو کوئی نہیں ہے وہ صرف اس نوجوان کے حالات سے باخبر ہوئی ہے اور اس کے ساتھ شادی کرنے پر اصرار کررہی ہے تاکہ اس نوجوان کی خدمت کا شرف حاصل کر کے اسلام کا حق ادا کر سکے۔

البتہ اس قسم کے واقعات جمہوری اسلامی ایران میں کئی مرتبہ پیش آئے ہیں۔ ان خواتین کو مبارک ہو۔

۹۔ میرے استادِ محترم و بزرگوار آیۃ اللہ حکیم (رح) نے نجف اشرف میں مجھ سے فرمایا: میرا دل چاہتا تھا کہ محدث نوری سے روایت بیان کرنے کی اجازت لوں، لیکن میں نے انہیں یہ تجویز پیش کی کہ مجھے زبانی اجازت دیں، تحریری نہ دیں۔ میں نے آقای حکیم کی خدمت میں عرض کی: آپ نے تحریری اجازت نامہ کیوں نہیں لیا۔ آپ نے فرمایا: اس لئے کہ میں جانتا تھا کہ آقای نوری اگر اجازت نامہ لکھ دیں تو اس میں القابات سے نوازیں گے اور میری عزت افزائی فرمائیں گے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس قسم کے القاب میرے لئے لکھے جائیں۔ قدس سرہ۔

۱۰ بحار میں منقول ہے: (دروغ برگردن راوی)

ایک دن عبداللہ بن زبیر نے امیرالمؤمنین ؑ کی خدمت میں عرض کی:

میں نے اپنے والد کی ڈائری میں دیکھا ہے کہ آپ کے والد کے ذمے اسی ہزار درہم ہیں، آپ نے فرمایا: تمہارے والد نے صحیح لکھا ہے۔ پھر اسی ہزار درہم عبد اللہ بن زبیر کو دے دیئے چند دن گزرنے کے بعد عبد اللہ بن زبیر نے آکر کہا: مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میرے والد کے ذمہ آپ کے والد کے اسی ہزار درہم ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: جو رقم تیرے والد نے، میرے والد سے لی تھی وہ رقم تیرے والد کو بخش دی اور جو رقم تو نے لی ہے وہ تجھے بخش دیتا ہوں۔

۱۱۔ جس دن عبد الملک مروان کوفے پر مسلط ہوا اور کوفہ کے دار الامارۃ میں حاکمِ کوفہ مصعب بن زبیر کا سر اس کے سامنے پیش کیا گیا تو حاضرین میں سے ایک شخص کے چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے جو سب نے محسوس کیئے، پھر اس شخص نے کہا ایک عرصہ پہلے میں اسی چھت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا کہ سیّد الشہداء علیہ السلام کا سرِ اقدس مرجانہ کے بیٹے عبید اللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا! اس کے بعد اسی جگہ بیٹھے یہ دیکھا کہ اس مجرم عبید اللہ بن زیادہ کا سر مختار ثقفی کے سامنے پیش کیا گیا اس کے بعد قضائے الٰہی سے اسی مجلس میں اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ مختار ثقفی کا سر مصعب کے سامنے پیش کیا گیا اور آج اسی جگہ دیکھ رہا ہوں، مصعب کا سر تیرے سامنے پیش کیا جا رہا ہے (یہ سارے واقعات اور حادثات دس سال کے اندر اندر رونما ہوئے)، امید ہے کہ تیرا انجام بخیر ہوگا۔

عبد الملک پر یہ تاریخی واقعات سُن کر وحشت طاری ہوگئی اور وہ گھبرا کر فوراً دار الامارۃ سے باہر نکل گیا اور بجائے اس کے اپنے اخلاق

وافعال کی اصلاح کرتا اس نے نادانی اور حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دارالامارہ کو منہدم کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

یک سرہ مردی زعرب ہوشمند — گفت بہ عبدالملک از روی پند
زیر ہمین گنبد و این بارگاہ — روی ہمین مسند و این تکیہ گاہ
بودم و دیدم بر ابن زیاد — آنچہ دیدم کہ دو چشم مبادا
تازہ سری چوں سپر آسمان — طلعت خورشید ز رویش عیاں
بعد ز چندی سر آن خیرہ سر — بد بر مختار بروی سپر
بعد کہ مصعب سر و سردار شد — دستکش او سر مختار شد

این سر مصعب بہ تقاضای کار
تا چہ کند باتو دگر روزگار

راقم الحروف کا ارادہ تھا کہ اس سے زیادہ داستانیں نقل کروں جو اخلاق اسلامی کے پیروکاروں کے لئے باعث تشویق و ترغیب ہوں لیکن ایک تو اس کام کے لئے فرصت نہ تھی اس کے علاوہ راقم اپنے آپ کو ان مقامات (اخلاقِ اسلامی) کا اہل نہیں سمجھتا۔ اس لئے ان داستانوں کو نقل کرتے ہوئے خجالت محسوس ہو رہی ہے۔

آخری داستان

ایک افغانی خاتون کے بارے میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا بیٹا کمیونسٹ ہو گیا تھا اور اس نے نماز ترک کر دی تھی اس مسلمان خاتون نے اپنے کافر بیٹے پہ خنجر کا وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

دعا کے بارے میں

خدا سے دعا مانگنا اور اس کی طرف توجہ کرنا اسلام کی نظر میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں دعا کی طرف مختصر سا اشارہ کیا جائے۔

۱۔ اِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔ (۲ : ۱۸۶)

"جب میرے بندے میرے نزدیک یا دور ہونے کے بارے میں پوچھیں تو یہ تحقیق میں ان کے نزدیک ہوں اور ان کی دعا قبول کرتا ہوں انہیں بھی چاہیئے کہ وہ مجھ پر ایمان لائیں۔"

۲۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ۔ (۲۷ : ۶۲)

"وہ کون ہے جو بیچاروں اور مجبوروں کی دعا قبول فرماتا ہے اور بدی (آسیب وغیرہ) کو دور کرتا ہے اور تمہیں زمین پر خلیفہ قرار دیتا ہے۔"

۳۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ .... وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ (۷ : ۵۵-۵۶)

اپنے رب کو گریہ اور خلوت کی حالت میں پکارو اور اس کے سامنے خوف اور طمع کی حالت میں دعا کرو۔

روایتِ صحیحہ میں امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

دعوۃ العبد سرا دعوۃ واحدۃ تعدل سبعین دعوۃ علانیۃً[1]

ایک دعا جو خلوت اور تنہائی میں مانگی جائے ستر ایسی دعاؤں کے برابر ہے جو ظاہراً اور دکھا کر مانگی جائیں۔"

صحیحہ زرارۃ میں امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

" لایکتب الملک الا ما سمع وقال اللہ عز وجل و اذکر ربک فی نفسک تضرعا و خفیۃ فلا یعلم ثواب ذلک الذکر فی نفس الرجل غیر اللہ عز وجل لعظمتہ۔"[2]

" فرشتے وہی لکھتے ہیں جو سنتے ہیں۔ نفس میں (دل ہی دل میں) جو ذکرِ خدا ہوگا اس کو سوائے ذاتِ خدا کے کوئی بھی نہیں جانتا۔"

۴۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ۔ (۴۰:۶۰)

" تمہارے رب نے فرمایا، مجھے پکارو میں تمہاری دعوت کو قبول کروں گا، جو لوگ میری عبادت (دعا)[3] سے سرکشی اور تکبر کرتے ہیں وہ ذلت کی حالت میں جہنم میں جائیں گے۔"

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۲۵۔ [2] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۶۲

[3] عبادت سے مراد دعا ہے اس آیہ کے ذیل میں صحیحہ زرارۃ میں امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: هو الدعاء افضل العبادۃ الدعا قلت ان ابراهیم لاواہ ←

۵۔ اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ۔ (۳ : ۳۸)

اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ۔ (۱۴ : ۳۹)

خدا کے ناموں میں سے ایک نام "سمیع الدعا" دعا کا سننے والا۔ ہے

۶۔ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ج فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ط كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۱۰ : ۱۲)

"جب انسان کو کوئی گزند پہنچے تو پہلو کے بل بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہو کر (ہر حالت میں) ہمیں پکارتا ہے اور جب ہم اس کا ضرر اس سے دور کر دیتے ہیں تو (ایسا مست ہو جاتا ہے) گویا اس نے سختی کے موقع پر ہمیں پکارا ہی نہ تھا۔"

اس آیۂ کریمہ سے دو چیزیں سمجھی جا سکتی ہیں:

۱۔ آرام اور آسودگی کی حالت میں غفلت، تکبر اور طغیان میں مبتلا اور سابقہ حالت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔

۲۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ خدا کو پکارتا رہے اور سختی و آسائش دونوں حالتوں میں ذکرِ خدا جاری رکھے، چنانچہ اس سلسلے میں روایات بھی ہیں۔[۱]

ـــــــے حلیم قال الاواہ ھو الدعا۔

آیۂ کریمہ میں عبادت سے مراد دعا ہے بلکہ دعا بہترین عبادت ہے، آیۂ کریمہ: ان ابراھیم لاواہ حلیم میں اواہ سے دعا کرنے والا مراد ہے۔

[۱] کلینی نے اس بارے میں ایک باب ترتیب دیا ہے اور چھ روایات نقل کی ہیں جن میں سے تین کی سند معتبر ہے۔

صحیحہ ہارون میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الدعاء فی الرخاء یستخرج الحوائج فی البلاء

آسائش اور آرام کی حالت میں دعا مانگنا آزمائش کے وقت کی احتیاجات کو دور کرتا ہے۔

صحیحہ ہشام میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو دعا میں پہل کرے یعنی آسائش میں بھی دعا کرتا ہو تو اس کی دعا آزمائش میں بھی قبول ہوتی ہے اور فرشتے کہتے ہیں یہ کوئی جانی پہچانی آواز ہے آسمان سے محروم واپس نہ جائے۔ ومن لم یتقدم فی الدعاء لم یستجب لہ اذا نزل بہ البلاء وقالت الملائکۃ ان ذاالصوت لانعرفہ اور اگر انسان دعا میں سبقت اور پہل نہ کرے تو وہ بلا کے موقع پر قبول نہیں ہوتی اور فرشتے کہتے ہیں ہم تو اس آواز سے مانوس نہیں۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ۔ (۴۱: ۵۱)

جب ہم انسان پر کوئی نعمت نازل کرتے ہیں تو وہ منہ پھیر لیتا ہے (ہمیں بھول جاتا ہے) اور جب اسے کوئی گزند پہنچے تو لمبی چوڑی دعائیں مانگنے لگتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام صحیحہ حماد میں فرماتے ہیں:

تم دعا کرتے رہو اور یہ نہ کہو جو مقدر میں تھا وہ ہو چکا۔ اس لئے کہ دعا تو عبادت ہے اور خداوند عالم فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ[1] (۴۰ : ۶۰)

امام صادق علیہ السلام صحیحہ تمار میں فرماتے ہیں:

علیکم بالدعاء فانکم لا تقربون بمثلہ ولا تترکوا صغیرۃ لصغرھا ان تدعوا بھا ان صاحب الصغار ھو صاحب الکبار[2]

دعا کو ہرگز ترک نہ کرو کیونکہ دعا سے زیادہ موجبِ قربِ الٰہی کوئی چیز نہیں اور چھوٹی سے چھوٹی حاجت بھی معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کرو اور نہ اس کے لئے دعا کو ترک کرو، کیوں کہ جس ذات کے دستِ قدرت میں چھوٹی حاجتیں ہیں اسی ذات کے قبضۂ قدرت میں بڑی حاجتیں بھی ہیں۔

نیز امام صادق علیہ السلام موثقہ سکونی میں رسولؐ اللہ سے روایت فرماتے ہیں:

الدعاء سلاح المؤمن وعمود الدین ونور السمٰوٰت والارض[3]

"دعا مؤمن کا اسلحہ، دین کا ستون اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔"

امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

الدعاء مفاتیح النجاح ومقالید الفلاح وخیر الدعاء

۱-۲ اصول کافی، ج ۴، ص ۲۱۲۔

۳ اصول کافی، ج ۴، ص ۲۱۳۔

ماصدر عن صدر نقی وقلب تقی وفی المناجات سبب النجاة وبالاخلاص یکون الخلاص فاذا اشتد الفزع فالی اللہ المفزع.

"دعا کامیابی کی کنجی ہے اور رستگاری کا خزانہ ہے، بہترین دعا وہ ہے جو ایک پاکیزہ سینے اور با تقویٰ دل سے نکلے نجات کا واحد ذریعہ مناجات ہے اور عذاب الٰہی سے رہائی اور گلو خلاصی اخلاص کے ذریعے ہوتی ہے جب بے تابی شدت اختیار کر جاتے تو پناہ گاہ صرف خدا کی ذات ہے:"

نیز صحیح روایت میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان الدعاء یرد القضاء ینقضہ کما ینقض السلک وقد ابرم ابراما[1]

دعاء قضاء الٰہی کو پلٹا دیتی ہے اور پیچیدگیاں کھول دیتی ہے جس طرح بٹا ہوا دھاگہ کھول دیا جاتا ہے جو کہ جس قدر بھی مضبوط بٹا گیا ہو پھر بھی کھلنے کے قابل ہوتا ہے:"

امام باقر علیہ السلام صحیحہ بزرارہ میں فرماتے ہیں:

الا ادلک علی شیءٍ لم یستثن فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قلت بلیٰ قال: الدعاء یرد القضاء وقد ابرم ابراما وضم اصابعہ[2].

"کیا تمہارے لئے ایسے عمل کی نشاندھی نہ کروں جس سے رسول اللہ بھی مستثنیٰ نہیں، راوی نے عرض کی مولا! فرمایئے آپ نے

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۱۵۔

[2] ایضاً: ۲۱۶۔

فرمایا: دعا قضا کو پلٹا دیتی ہے اگرچہ وہ قضا مضبوط و مستحکم ہی کیوں نہ ہو، اس کے بعد آنحضرتؐ نے اپنی انگلیوں کو آپس میں ملا کر قضائے محکم کو ان سے تشبیہ دی۔"

روایتِ صحیحہ میں امام کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

علیکم بالدعاء فان الدعاء للہ والطلب الی اللہ یرد البلاء و قد قدر وقضی ولم یبق الا امضاؤہ فاذا دعی اللہ عزوجل وسئل صرف البلاء صرفۃ۔

(یعنی) "دعا، وہ بلا دور کر دیتی ہے جو مورد تقدیر و قضائے الٰہی قرار پائی ہو اور صرف آخری دستخط باقی رہ گئے ہوں (کیونکہ جب کسی چیز یا کام کی علتِ تامہ متحقق ہو جائے تو معلول کا وجود میں نہ آنا غیر ممکن اور محال ہوا کرتا ہے)۔"

صحیحہ ہشام میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا الھم احدکم الدعاء عند البلاء فاعلموا ان البلاء قصیر۔[1]

"کسی بھی مصیبت کے زیادہ یا کم ہونے کا دارومدار دعا پر ہے اور اگر مصیبت کے فوراً بعد دعا مانگی جائے تو مصیبت چھوٹی ورنہ طویل ہو جاتی ہے۔"

لیکن ہشام کی روایت صحیحہ میں ہے کہ خدا نے فرمایا:

من شغل بذکری عن مسالتی اعطیتہ افضل ما اعطی من

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۱۹۔

سئلنی[1]

جو شخص میرے ذکر (عبادت) میں مصروف رہے جس کی وجہ سے مجھ سے سوال نہ کر پائے اس کو اس شخص کی نسبت بہتر صلہ دیتا ہوں جو مجھ سے سوال کرے۔"

لیکن اس روایت میں یا اس صورت کو فرض کیا گیا ہے جہاں عبادتگزار سوال فراموش کر دے جیسا کہ اس کی تائید صحیحہ ہارون سے بھی ہوتی ہے یا بعض آرزؤں کا یہ حکم ہے کیونکہ اس روایت کا مقصد ذکرِ الٰہی کو دعا پر ترجیح دینے کا شوق دلانا نہیں ہے، اس لئے کہ دعا تو دین کا ستون ہے۔

اختتامیہ۔ دعا کی قسمیں

۱۔ محمد بن مسلم کی روایت صحیحہ میں ہے کہ اس نے امام محمد باقر علیہ السلام سے آیہ کریمہ :

"فما استکانوا لربھم وما یتضرعون" کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا :

استکانت" سے مراد "خشوع و خضوع" ہے اور تضرع سے مراد دونوں ہاتھ بلند کر کے گریہ کرنا ہے۔

۲۔ محمد بن مسلم کی دوسری روایت صحیحہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

"رغبت سے مراد یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کھول دیئے جائیں اور ہتھیلیوں کو ظاہر کیا جاتے، رھبت کا معنی ہے کہ دونوں ہاتھ کھول دیئے جائیں

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۶۱۔

اور ان کی پشت ظاہر کی جائے۔ "تضرع" کا مطلب یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت کو دائیں بائیں حرکت دی جائے تبتل (کٹ جانا) سے مراد یہ ہے کہ بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کو حرکت دی جائے اور اسے آہستہ سے آسمان کی طرف بلند کریں اور پھر نیچے لے آئے۔ ابتہال یہ ہے کہ انسان ہتھیلیوں اور بازوؤں کو آسمان کی طرف کھولے اور "ابتہال" اس مرحلے پر صادق آتا ہے جب گریہ کے اسباب فراہم ہوں۔

۳۔ ابوبصیر کی روایت صحیحہ میں ہے کہ معصومؑ سے جب "دعاء" اور ہاتھ اٹھانے کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

دعاء کی چار قسمیں ہیں:

i۔ "تعوذ" یہ ہے کہ ہتھیلیوں کا رخ قبلہ کی طرف ہو۔ رزق کی دعا کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو پھیلایا جائے اور ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف ہو۔

ii۔ "تبتل" یہ ہے کہ انگشت شہادت کے ذریعے اشارہ کیا جائے۔

iii۔ "ابتہال" یہ ہے کہ دونوں ہاتھ سر تک بلند کئے جائیں۔

iv۔ دعائے تضرع یہ ہے کہ انگشتِ شہادت کو چہرے کے سامنے حرکت دی جائے۔ یہ خوف و ہراس کی دعا ہے۔[۱]

ان تین روایات میں دعا کی جو قسمیں (تضرع، رغبت، رہبت، تبتل،

---

[۱] اصول کافی مترجم، ج ۴، ص ۲۲۹ تا ۲۳۲۔

استہال، استعاذہ) بیان کی گئی ہیں وہ رزق کی دعا کی ہیں۔ اب جبکہ قرآن کی آیات اور معتبر روایات کی روشنی میں دعا کی اہمیت معلوم ہو چکی تو مندرجہ ذیل موضوعات پر توجہ فرمائیں:

۱۔ شرائطِ دعا

معتبر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ قبولیت دعا کی چند شرائط ہیں

۱۔ انسان اپنے مقصد اور ہدف کی طرف دل سے متوجہ ہو

ایک مرتبہ پیغمبر اکرم (ص) نے بارگاہِ الٰہی میں بارش کی دعا کی لیکن بارش نہیں ہوئی۔ لیکن جب دوسری مرتبہ دعا کی تو بارش ہو گئی، جب آنحضرت ص سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ ص نے فرمایا:

انی دعوت ولیس لی فی ذلک نیۃ! ثم دعوت ولی فی ذلک نیۃ۔[1]

پہلی مرتبہ نہ چاہتے ہوئے دعا مانگی تھی بعد میں قلباً دعا مانگی۔

۲۔ انسان دکھ اور سکھ دونوں میں دعا مانگتا رہے چنانچہ اس شرط کی تائید ذکر شدہ چھٹی آیت کے ضمن میں بیان کردہ روایات سے بھی ہوتی ہے۔

۳۔ انسان دعا کرتا رہے اور ایک دو مرتبہ دعا کرنے پر اکتفاء نہ کرے۔ اس شرط کی دلیل وہ روایات ہیں جو اصول کافی میں مذکور ہیں چنانچہ

---

[1] اصول کافی مترجم، جلد ۴، ص ۲۲۲۔

روایاتِ صحیحہ میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان العبد اذا عجل فقام لحاجتہ یقول اللہ تبارک وتعالیٰ اما یعلم عبدی انی انا اللہ الذی اقضی الحوائج؟[1]

"جب بندے دعا میں جلد بازی سے کام لیں اور جلدی اپنے (دنیاوی) کاموں کیلئے چلے جائیں تو خالق فرماتا ہے: کیا میرے بندے کو معلوم نہیں کہ میں وہ خالق ہوں جو لوگوں کی حاجات پوری کرتا ہے"؟

۴۔ رقت قلب و نرم دلی سے دعا کی جائے، چنانچہ روایات صحیحہ میں امامؑ فرماتے ہیں:

اذا رق احدکم فلیدع فان القلب لا یرق حتی یخلص۔[2]

"جس وقت تمہارا دل نرم ہو اس وقت دعا مانگا کرو، اس لئے کہ جب تک دل پر خلوص نہ ہو، نرم نہیں ہو سکتا، دل کا نرم ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ پر خلوص بھی ہے۔

۵۔ دعا سے قبل خدا کی حمد و ثنا کی جائے اور کسی حد تک اس کی صفات بھی بیان کی جائیں۔

۶۔ دعا کے ساتھ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور اس کی آل پر صلوات بھیجے۔ موثقہ ابان میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۲۳۔ [2] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۲۷۔

جو شخص بھی دعا کرنا چاہے پہلے صلوات بھیجے کیونکہ صلوات ضرور قبول ہوتی ہے اور خدا ایسا نہیں کرتا کہ) دعا کا بعض حصّہ (صلوات) قبول فرمائے اور بعض قبول نہ فرمائے (پس صلوات قبول ہونے کے ساتھ ساتھ دعا بھی قبول ہو جاتی ہے)[1]

۷۔ اپنے گناہوں کا اقرار کرے (اگر توبہ اور اقرار بھی ہو تو بہتر ہے) ان تین شرائط کا بھی روایات سے استفادہ ہوتا ہے۔[2]

۸۔ مؤمنین کی عدم موجودگی میں ان کے لئے دعا کی جائے

موسیٰ بن جعفر علیہ السلام نے جناب عبداللہ بن جندب سے فرمایا:

جب کوئی کسی مؤمن کے لئے اس کی پس پشت دعا کرے تو عرش سے یہ آواز آتی ہے: تیرے لئے ایک لاکھ گنا زیادہ (یہی دعا) موجود ہے۔"[3]

ایک اور صحیح روایت میں امامؑ فرماتے ہیں:

من قدم اربعین من المؤمنین ثم دعا استجیب لہ۔[4]

"جو کوئی چالیس مؤمنین کو اپنے اوپر ترجیح دے اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔"

---

[1] بحار ج ۹۴، ص ۵۳۔

[2] ص ۲۳۶ و ص ۲۴۷ صحیحہ ہشام میں امام صادقؑ فرماتے ہیں جب محمد اور آل محمد پر صلوات نہ بھیجی جائے دعا کی قبولیت روک دی جاتی ہے۔

[3] اصول کافی، ج ۴، ص ۱۷۲ روایت کی سند صحیح ہے۔

[4] ایضاً ص ۲۷۳۔

امام کاظم علیہ السلام صحیحہ صفوان میں فرماتے ہیں:

"جو شخص اپنے مؤمن بھائیوں کے لئے دعا کرے خداوند عالم ہر ایک مؤمن کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر فرماتا ہے جو اس دعا کرنے والے شخص کے لئے دعا کرتا ہے۔"

امام رضا علیہ السلام صحیحہ صفوان میں فرماتے ہیں:

مامن مؤمن یدعوا للمؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات الاحیاء منھم والاموات الارد الله علیہ من کل مؤمن و مؤمنۃ حسنۃ منذ بعث الله آدم الی ان تقوم الساعۃ۔[1]

"جو آدمی مؤمنین و مؤمنات، مسلمین و مسلمات زندوں اور مرحومین کے لئے دعا کرے خداوند عالم آدم سے لے کر قیامت تک آنے والے ہر مؤمن سے ایک نیکی اس دعا کرنے والے مؤمن کے نامۂ اعمال میں لکھ دیتا ہے۔"

مؤمنین کے لئے دعا کا ثواب بہت زیادہ ہے اس سلسلے کی روایات کو مرحوم مجلسی نے اپنی کتاب بحار الانوار میں نقل فرمایا ہے۔

۹۔ انسان خدا کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہو کہ خداوند میری دعا کو قبول فرمائے گا۔

۱۰۔ دعا عمومی ہونی چاہیئے کیونکہ ایسی دعا جلدی قبول ہوتی ہے

---

[1] بحار الانوار، ج ۹۳، ص ۳۸۶۔

رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

اذا دعا احدکم فلیعم فانہ اوجب للدعاء[1]

"جب تم میں سے کوئی دعا کرنا چاہے تو (دعا میں) سب کو شامل کرے کیونکہ اس طرح دعا جلدی قبول ہوتی ہے۔"

۲۔ شرائطِ دعا کے بارے میں ایک نکتہ

گزشتہ دس چیزوں کا شرطِ دعا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ جب تک یہ تمام شرائط موجود نہ ہوں یا بعض نہ ہوں دعا ہرگز قبول نہیں ہوتی یا ان شرائط کے مفقود ہونے کی صورت میں دعا مطلوبِ شارع نہیں ہے، بلکہ دعا ہر حالت میں عبادت ہے اور رجحان رکھتی ہے اور غالب گمان ہے کہ خداوند کریم اس دعا کو شرف قبولیت بخشے گا۔

جی ہاں! ارحم الراحمین ذات کی رحمت کی کوئی حدبندی نہیں خدا کی رحمت سے بالکل مایوس ہونا گناہِ کبیرہ ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ جب دعا کی مذکورہ شرائط موجود ہوں تو اکثر اوقات دعا قبول ہوتی ہے اور یہ شرائط دعا کو استجابت کے نزدیک کر دیتی ہیں

لہٰذا مناسب یہی ہے کہ دعا کے اپنے ہدف تک پہنچنے کے لئے ان شرائط کا خیال رکھا جائے

مناسب ہے کہ اس مقام پر بعض ایسے جملے یا حالات بیان کر دیئے جائیں جو استجابت دعا کا باعث بنتے ہیں، یہ جملے معتبر اسناد سے مروی ہیں۔ واللہ الموفق۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۹۳، ص ۳۸۶

۱۔ جو کوئی دس مرتبہ کہے "یا اللہ یا اللہ" اسے خدا کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے لبیک! کہو تمہاری کیا حاجت ہے؟[1]

۲۔ جو کوئی دس مرتبہ کہے "یا ربّ یا ربّ" اس سے کہا جاتا ہے، لبیک! تمہاری کیا حاجت ہے؟

۳۔ جو کوئی سانس کے ختم ہونے تک کہے "یا ربّ یا اللہ۔ یا ربّ یا اللہ" اس سے بھی کہا جاتا ہے لبیک تمہاری کیا حاجت ہے؟[2]

۴۔ جو کوئی دعا مانگنے کے بعد کہے "ما شاء اللہ لا حول و لا قوۃ الا باللہ"، خدا فرماتا ہے میرے بندے نے اپنا دِل مجھ سے لگا لیا ہے اور اپنے آپ کو میرے امر کے سپرد کر دیا ہے، اس لئے (اے فرشتو!) اس کی حاجت پوری کرو۔[3]

۵۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے کی گھڑی استجابتِ دعا کی ہے۔[4]

۶۔ جبرئیلؑ نے زندان میں حضرت یوسفؑ سے کہا کہ نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کریں:

اللّٰھم اجعل لی فرجا و مخرجا وارزقنی من حیث

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۸۷۔

[2] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۸۸۔

[3] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۸۹۔

[4] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۹۱۔

احتسب ومن حیث لا احتسب۔[1]

"اے پالنے والے مجھے خوشحالی اور آسائش عطا فرما اور مجھے متوقع اور غیر متوقع رزق عطا فرما۔"

۷۔ جو کوئی واجب نماز کے بعد تین مرتبہ کہے:

"یا من یفعل ما یشآء ولا یفعل ما یشآء احد غیرہ"۔

اور اس کے بعد دعا کرے اس کو وہی چیز دی جاتی ہے جس کا وہ سوال کرے۔

۸۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اذا نزلت برجل نازلۃ او شدیدۃ او کربۃ امر فلیکشف عن رکبتیہ وذراعیہ ولیلصقھما بالارض ولیلزق جؤجؤہ بالارض ثم لیدع بحاجتہ وھو ساجد۔[2]

"جس شخص کو کوئی حادثہ یا سختی پیش آئے یا کسی بات سے رنجیدہ ہو تو اسے چاہیئے کہ دونوں زانوؤں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک ننگا کرے اور انہیں زمین پر لگائے اور سینے کو بھی زمین پر لگائے اور سجدہ کی حالت میں اپنی حاجت طلب کرے۔"

۹۔ صحیحہ ثمالی میں حضرت سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں۔

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۳۲۹۔

[2] اصول کافی، ج ۴، ص ۳۳۸۔

ما من قطرة احب الی اللہ من قطرتین۔ قطرة دم فی سبیل اللہ و

قطرة دمعة فی سواد اللیل لا یرید بها عبد الا اللہ۔[1]

خدا کے نزدیک دو قطروں سے زیادہ محبوب کوئی قطرہ نہیں۔

i۔ خون کا وہ قطرہ جو راہِ خدا میں بہایا گیا ہے۔

ii۔ آنسوؤں کا وہ قطرہ جو رات کی تاریکی میں رضائے الٰہی کی خاطر گرے

۱۰۔ پانچ مقامات پر دعا کو غنیمت سمجھو (اور فرصت ہاتھ سے نہ جانے دو، بھرپور دعا مانگو):

i۔ قرآن پڑھتے وقت۔

ii۔ اذان کے وقت۔

iii۔ بارش ہوتے وقت۔

iv۔ جب وقتِ جہاد شہادت کے لیے دو صفیں آپس میں ملیں۔

v۔ مظلوم کی دعا کے وقت۔ کیونکہ مظلوم کی دعا کے عرش تک جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے[2]

۱۱۔ ایک معتبر روایت میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا اور جبرئیلؑ نے اپنی خدمات پیش کیں تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا: "اما الیك فلا" محتاج ضرور ہوں مگر تیرا محتاج نہیں" اور پھر فرمایا: یا اللہ یا احد یا صمد یا من لم یلد ولم

---

[1] بحار الانوار، ج ۹۳، ص ۳۲۹۔

[2] ایضاً ص ۳۴۳۔

یولد و لم یکن لہ کفواً احد، نجنی من النار برحمتک اس دعا کے بعد آگ پر وحی نازل ہوئی: یا نار کونی برداً و سلاماً علیٰ ابراہیم۔[1]

۳۔ جن کی دعا قبول یا رد ہوتی ہے

امام صادق علیہ السلام صحیحہ عیسیٰ میں فرماتے ہیں:

تین قسم کے لوگوں کی دعا قبول ہوتی ہے۔

i۔ حاجی۔

ii۔ مجاہد فی سبیل اللہ۔

iii۔ مریض۔[2]

موثقہ سماعہ میں امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

میرے والد گرامی امام باقر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے: ظلم سے اجتناب کرو کیونکہ مظلوم کی دعا آسمان کی طرف جاتی ہے۔[3]

غیر معتبر روایات میں امام عادل، نیک اولاد، والد، مؤمن برادر مؤمن کی غیبت میں، روزہ دار اور عمرہ بجا لانے والے کو مستجاب الدعوات (جن کی دعا قبول ہوتی ہے) قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] بحار الانوار، ج ۹۵، ص ۱۸۹۔

[2] ایضاً، ج ۹۵، ص ۲۷۲۔

[3] ایضاً، ج ۹۵، ص ۲۷۳۔

وہ لوگ جن کی دعا قبول نہیں ہوتی

۱۔ جسے خدا نے مال دیا ہو مگر وہ اسے غلط جگہوں پر خرچ کر دے اور پھر دعا مانگے پالنے والے! مال عطا فرما۔ ایسے آدمی کی دعا قبول نہیں ہوتی اور اس سے کہا جاتا ہے: کیا میں نے تمہیں اقتصاد (اعتدال پسندی کے ساتھ) اور میانہ روی کا حکم نہیں دیا تھا۔

۲۔ وہ مرد جو اپنی عورت کے لئے بددعا کرے اور خدا سے یہ حاجت طلب کرے کہ خدایا مجھے اس سے نجات دے، جب کہ خالق نے مرد کو طلاق کا حق دے رکھا ہے۔

۳۔ وہ آدمی جو اپنے ہمسائے کے لئے بددعا کرتا ہے جبکہ خالق نے اس کے لئے راستہ باقی رکھا ہے اور وہ یہ کہ یہ شخص اپنا مکان بیچ ڈالے اور اس کی ہمسائیگی سے دور ہو جائے۔

۴۔ وہ آدمی جو گھر بیٹھے اللہ سے رزق طلب کرے ایسے آدمی سے کہا جاتا ہے کیا میں نے تمہیں رزق طلب کرنے (کمانے) کا حکم نہیں دیا تھا۔

۵۔ وہ آدمی جس کے پاس مال ہو اور بغیر گواہ بنائے کسی کو قرض دے دے، بعد میں مقروض قرض ادا کرنے سے انکار کر دے تو ایسے آدمی سے کہا جاتا ہے کیا میں نے ایسے موقع پر گواہ رکھنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

لیکن یہاں اس سے مراد یہ بھی نہیں کہ ایسے افراد کی دعا ہرگز قبول نہ ہوتی ہوگی اور ان کی دعا، دعا نہیں ہے، اور ان روایات (جو کہتی ہیں فلاں فلاں کی

دعا قبول نہیں ہوتی) کو ان عام اور مطلق روایات کے مخصص اور مقید قرار نہیں دیا جا سکتا جن میں دعا کی ترغیب و تشویق دلائی گئی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی دانشمند یہ بات تسلیم کرے اور اس چیز پہ راضی ہو، یہ ثابت ہے کہ دوسرے افراد کی طرح ان افرد کی دعا قبول ہونے کا بھی احتمال ہے اگرچہ یہ احتمال بہت کم ہے۔

دعا قبول نہ ہونے کی وجہ

بعض یا اکثر اوقات لوگوں کی دعا بارگاہِ ایزدی میں قبول نہیں ہوتی جس سے دعا گو حضرات سرد دلی، بے رخی اور ناامیدی کا شکار ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ دعا کرنا بھی ترک کر دیتے ہیں۔ مگر دینی نصوص (معصومین[ع] کی احادیث) میں اس مایوسی کی سختی سے مذمت کی گئی ہے اور لوگوں کو دعا جاری رکھنے اور اس سلسلے میں ضدی اور مصر رہنے کی ترغیب دلائی گئی ہے کیونکہ ممکن ہے بعض اوقات کسی حاجت کو پورا کرنا دعا کے تکرار پر موقوف ہو اور اس کے علاوہ دعا چاہے قبول ہو یا نہ ہو دعا بذات خود عبادت بندگی اور غنی ذات کی درگاہ میں اپنی مسکینی اور بے چارگی کا اظہار ہے۔ اس لئے بعض روایات میں دعا کو نماز کی طرح "عمود الدین" اور ستونِ اسلام کے نام سے یاد کیا گیا ہے جو انتہائی قابلِ توجہ ہے بلکہ ہم نے اس سے قبل آیات اور روایات سے یہ استفادہ کیا ہے کہ حاجت پوری ہونے کی صورت میں بھی دعا مطلوبِ مولا ہے اور مسلمان کو ہر وقت خدا کے حضور میں دست بدعا رہنا چاہیے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری اکثر دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں جبکہ خدا نے وعدہ فرمایا ہے کہ میں بندوں کی دعا قبول کروں گا۔

جواب : یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ صرف دعا قبولیت اور استجابت کے لئے علّتِ تامہ نہیں ہے بلکہ دعا تو صرف قبولیت کی مقتضی ہے اگر قبولیت کی شرط یا شرائط پوری ہوں اور کسی قسم کا مانع بھی موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں خداوند عالم دعا قبول فرماتا ہے[1]

بنابریں اگر کوئی دعا مسترد کی جائے تو اس میں وعدہ خلافی نہیں ہے اور نہ خدا کی طرف سے کم لُطفی (مہربانی میں کمی) ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو دعا مانگی گئی ہے اس کا پورا کرنا مانگنے والے کے لئے نقصان دہ ہو اور وہ نادانستہ ایسی چیز مانگتا ہے جو اس کے لئے مضر ہو۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مانگنے والے کی ذات کے لئے تو نقصان دہ نہیں ہوتی مگر دوسروں کے لئے یا نظم کائنات کے لئے ضرر رساں ہے اور کبھی مانگی ہوئی چیز کی علت میں دعا کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

---

[1] جس طرح کسی جسم کو جلانے کے لئے آگ مقتضی ہے جسم کا آگ کے نزدیک ہونا شرط ہے اور جسم کا تر ہونا مانع ہے پس احراق (آگ کا جلانا) اس وقت متحقق ہوگا جب مقتضی اور شرط موجود ہوں اور مانع مفقود ہو (جسم خشک ہو) دعا بھی آگ کی طرح مقتضی ہے اگر دعا کے ساتھ استجابت کی شرائط موجود ہوں اور مانع قبول مفقود ہو تب دعا قبول ہوگی ورنہ نہیں (مترجم)

ظاہر ہے کہ اسباب اپنے مسببات میں خدا کے اذن سے اثر کرتے ہیں
ممکن ہے قارئینِ محترم کے ذہن میں دعا کی تشریع (شریعت میں دعا کا حکم دینے) کے بارے میں یہ سوال پیدا ہو کہ دعا بہتر نہ ہونے کے علاوہ لغو اور فضول بھی ہے، کیونکہ اگر دعا سے غرض کوئی با مصلحت چیز ہے تو خدا کی حکیم ذات کسی کی دعا کے بغیر مطلوب کو ایجاد فرماتا ہے اور وہ کسی مصلحت پر مشتمل نہیں تو اس کے لئے جتنا بھی اصرار کیا جائے اور دعا کی جائے اس کی ایجاد یا اس عمل کی انجام دہی قبیح اور حکمت الٰہی کے منافی ہو گی جو خدا کے شایانِ شان نہیں۔

دوسرے الفاظ میں ان آیات اور روایات (جو دعا کی استجابت پر دلالت کرتی ہیں) کا معنی یہ ہو گا کہ میرے بندو! تم دعا کرو اور مجھ سے مانگو تاکہ تمہیں وہ چیز دوں جس میں مصلحت ہے جب کہ خدا (جو حکیم علی الاطلاق ہے) بغیر دعا کے بھی وہ چیز دے سکتا ہے جس میں مصلحت ہو۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دینی نصوص اور روایات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بندے کی دعا اور اس کی گریہ وزاری بذاتِ خود مصلحت اور مفسدہ کا جزء، علت یا علت تامہ (جزوی یا کل علت) قرار پاتی ہے۔

مثال کے طور پر فلاں نعمت زید کو ملنے میں بذاتِ خود کوئی مصلحت نہ ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ مفسدہ ہو، اس لئے خدا وہ نعمت اسے نہیں دیتا عین ممکن ہے کہ اس کی دعائیں اس مفسدہ کو زائل کر دیں اور اس کی مطلوبہ نعمت کو خدا با مصلحت بنا دے اور اس مصلحت کے حاصل ہونے کے بعد خالق وہ نعمت اس کو کثرت سے دے دے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ عالم ہستی میں جو کچھ بھی رونما ہوتا ہے وہ ازل ہی سے مقدر و معین ہے اور مورد قضائے الٰہی قرار پا چکا ہے تو پھر دعا کا کیا فائدہ ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جو مورد قضائے الٰہی قرار پاتی ہیں بشرطیکہ دعا کی جائے اور بعض چیزیں مورد قضائے الٰہی قرار پاتی ہیں چاہے دعا نہ مانگی جائے۔ مثال کے طور پر زید کو ایک فرزند دیا جانا مورد قضائے الٰہی ہے مگر اس صورت میں جب کہ وہ شادی کرے یا وہ ہمبستری سے پہلے خودکشی نہ کرلے۔

ایک اور اعتراض

ہمیں دعا کرنے اور نہ کرنے والوں کی قسمت یکساں نظر آتی ہے بلکہ دعا گو کا دوسروں کی نسبت برا حال ہوتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں تارکِ دعا تو اپنے مقصد تک پہنچ جاتا ہے مگر دعا گو مایوس و محروم رہتا ہے۔

جواب : ہوتا تو ایسا ہی ہے مگر اس کا راز یہ ہے کہ بعض واقعات یا افعال ایسے ہیں جن کے علل و اسباب میں دعا کو دخل ہوتا ہے اور بعض واقعات ایسے ہیں جن کے علل و اسباب میں دعا کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر دوسری صورت ہو (شاید اکثریت ایسے واقعات کی ہو) تو تارکِ دعا تو مطلوب سے بہرہ مند ہو جاتا ہے اور دعا گو محروم ہو جاتا ہے چنانچہ قانونِ علّت کا تقاضا بھی یہی ہے، البتہ دعا گو کو اس کی دعا کا اجر و ثواب ضرور ملے گا کیونکہ دعا ایک عبادت ہے، بلکہ اگر اس کی دعا قبول ہو تب بھی اس کو اجر ملے گا۔

اس لئے کہ اس نے ایک اہم عبادت انجام دی ہے۔

دعا قبول ہونے میں تاخیر

کبھی دعا کا اثر دیر سے ظاہر ہوتا ہے اور دعا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی۔

امام صادق علیہ السلام صحیحہ ہشام میں فرماتے ہیں:

خدا کے اس فرمان قد اجیبت دعوتکما، یعنی "تم دونوں (موسیٰ وہارون) کی دعا قبول ہو گئی" اور فرعون پر عذاب نازل ہونے کی درمیانی مدت چالیس سال تھی[1] *

کبھی اس لئے دعا تاخیر سے قبول ہوتی ہے کہ حصول مطلوب کی شرائط تاخیر سے پوری ہوتی ہیں، اور کبھی اس لئے دیر سے دعا قبول ہوتی ہے کہ خداوند اپنے خاص بندے کی آواز اور گریہ وزاری زیادہ سے زیادہ سننا چاہتا ہے۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان مؤمن یسئل اللہ عز وجل حاجۃ فیؤخر عنہ تعجیل

---

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۴۵۔

* یعنی جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے فرعون کے خلاف بددعا کی تو انہیں کہا گیا "قد اجیبت دعوتکما" یعنی "میں نے تمہاری دعا قبول کر لی" لیکن اس دعا کا اثر چالیس سال کے بعد ظاہر ہوا اور فرعون پر عذاب نازل ہوا (مترجم)

اجابتہ جبا لصوتہ و استماع نحیبہ[1]

"جب مومن خدا سے کوئی حاجت طلب کرے تو اس کی دعا جلدی قبول نہیں ہوتی کیونکہ خدا کو اس کی آواز سے محبت ہے اور اس کی آہ و بکا سننا چاہتا ہے:"

صحیحہ عبداللہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

یامر بقضاء حاجتہ عدوہ فانہ یکرہ ان یسمع ندائہ و صوتہ[2]

"اور جب کوئی دشمن (گنہگار) حاجت طلب کرے تو اسے جلد پورا کرنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ خالق کو اس کی آواز سے کراہت ہوتی ہے:"

اس بحث کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے، بزنطی کی روایت بیان کر دی جائے جس کی سند بہت معتبر ہے[3] بزنطی نے امام رضاؑ کی خدمت میں عرض کی:

"مولا! میں آپ پر نثار ہوں، چند سال سے میں نے خدا کے ہاں ایک درخواست کر رکھی ہے، مگر ابھی تک قبول نہیں ہوئی، تاخیر کی وجہ سے میرے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں:"

آپؑ نے فرمایا:

۱ے اصول کافی، ج ۴، ص ۳۴۳۔

۲ے اصول کافی، ج ۴، ص ۲۴۶۔

۳ے اصول کافی، ج ۴، ص ۳۴۳۔

احمد خبردار!

مبادا شیطان کو تجھے گمراہ کرنے کا کوئی راستہ مل جائے۔ اس لئے کہ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: "اگر مؤمن خدا سے کوئی حاجت طلب کرے اور اس کے پوری ہونے میں تاخیر ہو جائے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خداوند عالم اس مؤمن کی آواز سننا چاہتا ہے۔"

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

خدا کی قسم! خدا مؤمنین کی حاجات کو جتنی دیر سے قبول کرتا ہے اتنا ہی بہتر ہے۔ اس حاجت کی نسبت، جو جلدی پوری کر دی جائے اور دنیا کی حیثیت ہی کیا ہے؟ امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: مؤمن کو چاہیئے کہ آسائش وسکون کی حالت میں اسی طرح دست بہ دعا رہے جس طرح سختی کے موقع پر مشغولِ دعا رہتا ہے۔ اگر اس کی حاجت پوری کر دی جائے تو اس کے بعد اسے سست نہیں ہونا چاہیئے۔ پس تم کبھی بھی دعا سے دل برداشتہ نہ ہونا، کیونکہ خدا کے نزدیک دعا کا مقام بہت بلند ہے دیکھو صبر کا دامن نہ چھوٹنے پائے، ہر وقت رزقِ حلال کی تلاش میں رہو اور صلہ رحمی میں کوتاہی نہ کرو۔ مبادا لوگوں سے دشمنی کا اظہار کر بیٹھو۔ کیونکہ ہمارا خاندان وہ ہے جو قطع رحمی کرنے والوں سے صلہ رحمی کرتا ہے اور برا سلوک کرنے والوں سے نیکی اور احسان سے پیش آتا ہے۔ خدا کی قسم! اس کام کا انجام (دنیا و آخرت دونوں میں) اچھا دیکھو گے۔

اس دنیا میں جس کسی کے پاس کوئی نعمت ہے، اگر خداوند ہر وقت اس کی درخواست منظور اور حاجت پوری کر دے تو اس کا لالچ بڑھتا

جاتا ہے اس کے مطالبات اور حاجتیں بڑھتی جاتی ہیں جس کے نتیجے میں خدا کی نعمتوں کی قدر اس کی نظر میں کم ہو جاتی ہے اور وہ کبھی بھی کسی چیز سے سیر نہیں ہوتا اور جب فراواں نعمتیں آجائیں تو مسلمان کا ایمان خطرے میں پڑجاتا ہے کیونکہ جب نعمتیں زیادہ ہوں گی تو لوگوں کے حقوق بھی اس کے پاس زیادہ ہوں گے اور ادھر یہ خطرہ ہوگا کہ مسلمان ان حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا، اس طرح وہ آزمائش میں مبتلا ہوگا۔"

اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا:

"یہ بتاؤ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے، اس پر تمہارا بھروسہ اور اعتماد ہے کہ نہیں؟"

میں (بزنطی) نے عرض کی:

"میں آپ پر نثار! اگر آپ کی بات پر اعتماد نہ ہو تو پھر کس کی بات پر اعتماد ہوگا، جب کہ مخلوق پر آپ خدا کی حجت ہیں۔"

آپ نے فرمایا:

"اگر یہ بات ہے (حجت خدا ہونے کی وجہ سے مجھ پر اعتماد ہے)، تو خدا اور اس کے وعدوں پر اعتماد اس سے بھی زیادہ ہونا چاہیے، کیونکہ خدا نے تیری دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ صرف یہ کہ تیری دعا کی قبولیت ایک خاص مدت تک ملتوی کردی گئی ہے۔ کیا خدا نے یہ نہیں فرمایا: "جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں (تو یہ جان لیں) میں ان کے نزدیک ہوں اور ان لوگوں کی دعا قبول کرتا ہوں جو مجھے پکاریں۔" نیز خدا نے فرمایا ہے: "رحمتِ خدا سے مایوس نہ ہو۔" خدا تمہیں اپنی رحمت اور فضل وکرم کی بشارت دیتا

ہے، اس لئے دوسروں کی نسبت خدا پر تمہارا اعتقاد و اعتماد زیادہ ہونا چاہیئے اور اپنے دل میں ہمیشہ اچھے خیالات اور اعتقادات کو جگہ دو کیونکہ خدا نے تمہارے گناہ بخش دیئے ہیں۔[1]

۲۔ صحیحہ جمیل میں منقول ہے:

ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی: مولا میں آپ پر قربان ہوجاؤں کیا وجہ ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں مگر ہماری دعا قبول نہیں ہوتی؟ جبکہ خدا نے خود فرمایا ہے "تم دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔" آپؑ نے فرمایا: تمہاری دعا اس لئے قبول نہیں ہوتی کہ تم نے عہدِ الٰہی کو پورا نہیں کیا اور خداوند عالم فرماتا ہے: اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (یعنی) "تم میرے وعدوں اور عہدوں کو پورا کرو میں تمہارے وعدوں اور عہدوں کو پورا کروں گا۔" خدا کی قسم، اگر تم عہدِ الٰہی کو پورا کرتے تو خدا بھی اپنے عہد کو پورا کرتا ہے۔[1]

یادِ خدا کا بیان[2]

قال اللہ: وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى۔ (۲۰ : ۱۳۰)

۱؎ بحار، ج ۹۳، ص ۳۶۸۔

۲؎ ان مطالب کی معتبر روایات، اصول کافی، ج ۴، ص ۴۲۵ تا ۱۰۱۳ پر موجود ہیں۔

"آفتاب نکلنے سے قبل اور اس کے غروب ہونے سے قبل اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح کیا کرو اور کچھ رات کے وقتوں میں اور دن کے کناروں میں تسبیح کرو تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔"

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ. وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ.

(۵۰ : ۳۹-۴۰)

"آفتاب کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کیا کرو اور تھوڑی دیر رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو۔"

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ. وَلَهُ الْحَمْدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ.

(۳۰: ۱۷-۱۸)

"پھر جس وقت تم لوگوں کی شام ہو اور جس وقت تمہاری صبح ہو خدا کی پاکیزگی ظاہر کرو اور سارے آسمان و زمین میں تیسرے پہر کو اور جس وقت تم لوگوں کی دوپہر ہو جائے۔"

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ. وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ.

(۵۲ : ۴۸-۴۹)

"جب تم اٹھا کرو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کیا کرو اور کچھ رات کو بھی اور ستاروں کے غروب ہونے کے بعد بھی تسبیح کیا کرو۔"

۱۔ ہر مجلس اور نشست میں خدا، رسول اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کا ذکر ہونا چاہیئے ورنہ روزِ قیامت یہ مجلس باعث حسرت ہوگی۔

۲۔ جب انسان مجلس سے اٹھے تو اسے کہنا چاہیئے "سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

(۳۷ : ۱۸۱-۱۸۲)

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: آیا ایسے مقامات ہیں جن سے تجھے عزیز تر سمجھ کر تجھے یاد کروں۔ خالق نے فرمایا اے موسیٰ میرا ذکر ہر حالت میں بہتر ہے اور نیک ہے۔

۴۔ حضرت زہرا ؑ کی تسبیح اس ذکرِ کثیر میں شامل ہے جس کے بارے میں خدا فرماتا ہے اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا۔

۵۔ فقراء نے رسول اکرم کی خدمت میں عرض کی دولت مند اور امیر لوگ غلام آزاد کرتے ہیں، حج کے لئے جاتے ہیں، صدقہ دیتے ہیں اور جہاد کرتے ہیں، لیکن ہم اس سعادت سے محروم ہیں۔ آپ ؐ نے فرمایا: جو شخص سو مرتبہ تکبیر "اَللّٰهُ اَكْبَرْ" کہے، سو غلام آزاد کرنے سے بہتر ہے، اور جو شخص سو مرتبہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ" کہے، حج کی قربانی کے لئے سو اونٹ روانہ کرنے سے بہتر ہے اور جو شخص سو مرتبہ الحمد للّٰہ کہے راہِ خدا میں جہاد کے لئے سو گھوڑوں کے بھیجنے سے بہتر ہے جن کی لگامیں

سوار کے ہاتھ میں ہوں۔ اور جو شخص سو مرتبہ "لا الٰہ الا اللّٰہ" کہے وہ شخص روزِ محشر عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوگا۔[1]

۶۔ جو شخص بھی طلوع اور غروب آفتاب سے پہلے دس مرتبہ یہ دعا پڑھے اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ وَیُمِیْتُ وَیُحْیِیْ وَھُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ[2]

۷۔ جو شخص نمازِ صبح کے موقع پر سو مرتبہ یہ ذکر پڑھے روزِ محشر کوئی ناپسندیدہ چیز اسے نظر نہیں آئے گی۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔
بعض روایات میں اس ذکر کو سو یا سات یا تین مرتبہ پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے۔

۸۔ روزِ محشر میزانِ اعمال میں محمدؐ و آلِ محمدؐ پر صلوات سے زیادہ وزنی

---

[1] ہر عمل کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے جو اسی عمل میں پائی جاتی ہے دوسرے اعمال (چاہے ان کی مصلحت کتنی ہی زیادہ اور اہم ہو) میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فلاں عمل (جس کی اہمیت اتنی زیادہ نہیں) فلاں عمل سے جس کی اہمیت زیادہ ہے اپنی خصوصیت کے اعتبار سے بہتر ہے اگرچہ دوسرا (اہم) عمل اپنی خصوصیت کے اعتبار سے پہلے عمل سے کئی گنا بہتر ہے۔

[2] ایک روایت میں اس ذکر کو سنت واجب (مستحب واجب) کا نام ←

کوئی عمل نہ ہوگا۔ انسان کے اعمال میزان میں رکھ دیئے جائیں گے اور یہ ہلکے ہوں گے، لیکن جب صلوات بر محمدؐ و آل محمدؐ ظاہر ہوگی اور اسے اعمال میں رکھا جائے گا تو اس کے اعمال کا وزن بڑھ جائے گا، اور پلہ میزان جھک جائے گا۔[1]

معتبر روایت میں معصوم فرماتے ہیں:
جمعہ کے دن محمدؐ و آلِ محمدؐ پر صلوات سے بہتر کوئی عمل نہیں۔[2]
الحمد للہِ ربّ العالمین عدد ما فی علمہ وصلّی اللہ علی محمد وآلہ ما دامت السموات والارض۔

۹۔ شبِ معراج جب سرکارِ رسالتؐ بہشت میں داخل ہوئے اور یاقوت کا بنا ہوا صرف ایک محل دیکھا جو اتنا شفاف تھا کہ جس کے اندر سے باہر کا اور باہر سے اندر کا حصّہ دیکھا جا سکتا تھا اور اس میں دُر کے موتیوں اور زبرجد کے دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ آپؐ نے جبرئیل

← دیا گیا ہے اگر نسیاناً ترک ہو جائے تو نماز کی طرح قضا بجا لایا جائے۔
صحیحہ بن مسلم میں امام باقر علیہ السلام سے جب تسبیح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ما علمت شیئاً موظّفاً غیر تسبیح فاطمہ(ع) وعشر مرات بعد الفجر لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ... الخ (یعنی میں نے تسبیح حضرت زہرا علیہا السلام اور دس مرتبہ اس ذکر کے علاوہ کسی اور ذکر کو سنّت واجب (مستحب مؤکدہ) نہیں پایا۔

[1] اصول کافی، ج ۴، ص ۲۵۲۔ [2] بحار، ج ۹۴، ص ۵۰۔

سے پوچھا: یہ محل کس کے لئے بنا ہے؟ جبرئیل نے جواب دیا: یہ محل اس شخص کا ہے جس کا کلام پاکیزہ ہو اور ہمیشہ روزے رکھتا ہو اور کھانا کھلانے والا ہو، جب لوگ سوئے ہوں تو وہ نماز تہجد پڑھتا ہو۔ امیر المؤمنینؑ نے عرض کی: یا رسول اللہ کیا آپ کی اُمّت کا کوئی فرد اس عمل کی قدرت رکھتا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: میرے نزدیک آجاؤ امیر المؤمنینؑ نزدیک گئے، رسولِ خدا (ص) نے فرمایا: تمہیں معلوم ہے کہ اچھا کلام کون سا ہے؟ اچھا کلام یہ ہے: "سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرْ" کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے رمضان کے روزے رکھے اور ایک دن بھی افطار (قضا) نہ کرے، تمہیں معلوم ہے کہ طعام کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال اور ان کی آبرو کی حفاظت کی خاطر رزق طلب کرے، کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب لوگ سوئے ہوئے ہوں تو تہجد کا مطلب کیا ہے؟ یعنی وہ آدمی جو نماز عشاء پڑھنے سے قبل نہ سوئے اور لوگوں سے مراد یہود اور ترسا[1] ہیں جو نماز عشاء سے قبل سو جاتے تھے۔[2]

۱۰۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

"جب شبِ معراج بہشت میں داخل ہوا تو کچھ فرشتے نظر آئے جو تعمیر میں مصروف ہیں اور وہ ایک اینٹ سونے اور ایک اینٹ چاندی کی استعمال

---

[1] ایک فرقہ ہے۔

[2] بحار، ج ۹۳، ص ۱۶۸، بحار نے تفسیر قمی سے انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے حماد اور حماد نے امام جعفر صادق (ع) سے یہ روایت نقل کی ہے، روایت کی سند ظاہراً صحیح ہے۔

کرتے رہے ہیں اور کبھی کبھی کام کرتے کرتے رک جاتے ہیں، میں نے ان فرشتوں سے پوچھا: اس کی کیا وجہ ہے کہ تم کبھی تعمیر میں مصروف رہتے ہو اور کبھی رک جاتے ہو۔ فرشتوں نے جواب دیا: مصالحہ پہنچتا رہتا ہے تو ہم تعمیر جاری رکھتے ہیں اور جب مصالحہ آنا بند ہو جائے تو کام رک جاتا ہے میں نے پوچھا: اس عمارت کا مصالحہ کیا ہے؟ فرشتوں نے جواب دیا: اس کا مصالحہ مؤمن کا یہ ذکر ہے:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرْ

جب تک مؤمن یہ ذکر کرتا رہتا ہے تو ہم کام کرتے رہتے ہیں اور جب مؤمن یہ ذکر چھوڑ دیتا ہے تو ہم کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں[1]

۱۱۔ جو شخص کہے: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِهٖ، خداوند کریم اس کے نامۂ اعمال میں تین ہزار نیکیاں لکھ دیتا ہے اور تین ہزار برائیاں مٹا دیتا ہے اور تین ہزار درجے اور مقام اسے دیتا ہے اور خداوند عالم اس ذکر سے جنت میں ایک پرندہ خلق فرماتا ہے جو تسبیح پڑھتا رہتا ہے اور اس کا ثواب مؤمن کو ملتا رہتا ہے[2]

۱۲۔ حضرت آدم (ع) نے وسوسہ اور حزن و ملال کی شکایت کی تو جبرئیلؑ نے کہا: آپ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ پڑھا کیجیے، اس کو پڑھنے سے

---

[1] بحار، ج ۹۳، ص ۱۶۹، اس کی سند بھی گزشتہ روایات والی سند ہے، اس کے علاوہ بھی ایک اور سند سے یہ روایت منقول ہے۔

[2] بحار، ج ۹۳، ص ۱۸۲، اس کی سند میں محمد بن خالد برقی ہیں۔

حضرت آدم (ع) کا وسوسہ اور حزن و ملال دور ہو گیا۔[1]

وہ جملے جن کی حضرت آدم (ع) کو تعلیم ہوئی اور انہی کی وجہ سے ان کی توبہ قبول ہوئی یہ ہیں۔

اللّٰھم لا الہ الّا انت سبحٰنک و بحمدک انی عملت سوا و ظلمت نفسی فاغفرلی انک انت التواب الرحیم،

لا الہ الا انت سبحانک و بحمدک عملت سوا و ظلمت نفسی فاغفرلی انک انت خیر الغافرین۔[2]

صحیح ابن سنان میں امام صادق (ع) فرماتے ہیں:

ایک رات پیغمبر اکرم (ص) جناب ام سلمہ کے گھر تھے، رات کے وقت جناب ام سلمہ نے آپؐ کو بستر استراحت پر نہ پایا۔ جناب ام سلمہ نے اٹھ کر آپؐ کو گھر کے اطراف میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ گھر کے کونے میں دیکھا کہ آنحضرتؐ ہاتھ اٹھا کر گریہ فرما رہے ہیں اور یہ دعا پڑھ رہے ہیں:

اللّٰھم لا تنزع منی صالح ما اعطیتنی ابدا، اللّٰھم لا تشمت بی عدوا ولا حاسدا ابدا اللّٰھم ولا تردنی فی سوء استنقذتنی منہ ابدا، اللّٰھم ولا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین ابدا ..... الخ[3]

---

[1] بحار، ج ۹۳، ص ۱۸۶۔

[2] بحار، ج ۹۵، ص ۳۵۴۔

[3] ایضاً ص ۳۵۲۔

"پالنے والے! جس کارِ خیر کی تو نے مجھے توفیق دی اس کو سلب نہ کر۔ پالنے والے! میرے کسی دشمن اور حاسد کو خوش نہ کر، مجھے اس برائی میں دوبارہ نہ ڈال جس سے تو نے مجھے نجات دی۔ پالنے والے! لمحہ بھر کے لئے بھی مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر۔"

اللہ تعالیٰ کی مدد سے کتاب اختتام کو پہنچی۔ و لہ الحمد اولا و آخراً کما ھو اھلہ وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد و آلہ۔

ایران۔ قم، سنہ ۱۳۶۴ ہجری شمسی

تنقید و تجاویز ارسال کرنے کے لئے پتہ:

ایران۔ قم۔ ص۔ پ ۲۰۰

محسنی

خدا کی توفیق اور نصرت شامل حال رہی اور ۹ جمادی الثانیہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۰/۹ فروری ۱۹۸۷ء آخرِ شب پانچ بجکر دس منٹ پر اس کتاب کا ترجمہ مکمل ہوا۔ والحمد للہ علیٰ توفیقہ و نصرہ وصلی اللہ علی محمد و آلہ اشرف بریتہ۔

محمد شفا نجفی

فہرست

انتساب ۵ ــ اپنی بات ۷ ــ تتمہ مقدمہ ـ اخلاقِ حسنہ سے نزدیکی یا اس کے لئے راہ ہموار کرنا ۹ ــ یادِ خدا ۹ ــ خدا سے محبت ۱۰ ــ یادِ موت دفنا ۱۰ ــ بلند ہمتی ۱۱ ــ زیادہ فکر کرنا ۱۲ ــ مطالعہ ۱۴ ــ تقوی ۱۴ ــ ہیجان خیز چیزوں سے دوری ۱۵ ــ نیکوں کی رفاقت ۱۵ ــ نفس کو سزا دینا ۱۶ ــ بیرونی نگرانی ۱۶ ــ بدگوئی وتنقید پر توجہ ۱۷ ــ تربیت کا اثر ۱۷ ــ نفسیات وطب کا مطالعہ ۱۸ ــ گردو پیش کے ماحول پر نظر ۱۸ ــ حالات قلب ۱۹ ــ قلب لاہی ۲۲ ــ قلب رایغ ۲۲ ــ قلب غافل ۲۲ ــ صدر ضیق وشروح ۲۲ ــ قلب قسی ۲۳ ــ قلب و نفس امارہ ۲۳ ــ قلب مریض ۲۳ ــ قلب مقفول ۲۳ ــ قلب مکنون ۲۴ ــ قلب مختوم ۲۴ ــ قلب مطبوع ۲۴ ــ قلب وجل ۲۴ ــ قلب خاشع ۲۴ ــ قلب منیب ۲۵ ــ قلب مطمئن ۲۵ ــ نفس لوامہ ۲۹ ــ دِل کے خیالات ۳۲

پہلا حصّہ

خدا سے انسان کا اخلاقی رابطہ ــ خدا سے محبت و دوستی ۳۷

ــ حبِ خدا کے آثار ۳۹ ــ مصائب کا خطرناک جال ۴۱ ــ مصائب وآلام کے علل و اسباب ۴۳ ــ یادِ خدا ۵۰ ــ اخلاص ۵۲ ــ ریا ، سمعہ اور تکلف ۵۵ ــ یقین رکھنا ۵۸ ــ اختتامیہ ۶۲ ــ توکل بخدا ۶۴ ــ توکل پر ایک بحث ۶۵ ــ تفویض ۶۹ ــ تسلیم بہ خدا ۶۹ رضائے خدا ۷۳ شکرگزاری ۷۶ شکر کی تفسیر ۷۷ خشوع وخضوع ۸۰ ــ حیاء ۸۳ ــ خشیت ـ خوفِ خدا ۸۴ ــ خوفِ خدا کا معنی ۸۵ ــ خوف ۸۶ ــ خوف کے بارے میں آخری اور معتبر روایت ۸۹ ــ امید وعدم یاس ۹۰ ــ مکر الٰہی سے بے خطر نہ ہونا ۹۱ ــ حسن ظن ۹۲ ــ وفائے عہد ۹۴ ــ ہر چیز میں خود کو خدا کا محتاج سمجھنا ۹۵ ــ توبہ کرنا ۹۶ ــ خلاصہ ۹۹

دوسرا حصّہ ۱۰۳

انسان کا انفرادی اخلاق

تفکر ۱۰۵ ــــ درجات فکر کا ایک درجہ مراقبہ ومحاسبہ نفس ہے ۱۰۷ ــــ غور طلب نکتہ ۱۰۹ ــــ زندگی کے بارے میں حسن ظن ۱۱۰ ــــ تحصیل علم ۱۱۱ ــــ زہد ۔ پرہیز گاری ۱۱۴ ــــ دوسرا مطلب ۱۱۷ ــــ تیسرا مطلب ۱۲۰ ــــ چوتھا مطلب ۱۲۴ ــــ زہد کے بارے میں ۱۲۹ ــــ زہد کی دوسری قسم ۱۳۰ ــــ زہد کی تیسری قسم ۱۳۱ ــــ زہد معتبر روایات کی روشنی میں ۱۳۵ ــــ جاہ ومقام وشہرت سے محبت نہ ہونا ۱۳۶ ــــ بغض معصیت ۱۴۱ ــــ حق کی حمایت ۱۴۴ ــــ قناعت ۱۴۵ ــــ بلند ہمتی ۱۴۸ ــــ صبر وتحمل ۱۵۰ ــــ صبر کا معنی ۱۵۳ ــــ گناہوں کے زوال میں بیماری کا اثر ۱۵۹ ــــ عفت و پاکدامنی ۱۶۲ ــــ برائی سے زبان بچانا ۱۶۴ ــــ عجب و خود پسندی ۱۶۷ ــــ اس بحث کے آخر میں دو احادیث ۱۷۰ ــــ تزکیہ نفس ۱۷۱ ــــ شجاعت ۱۷۲ ــــ خوف کی قسمیں ۱۷۳ ــــ وقار ۱۷۴ ــــ حلم وبردباری ۱۷۶ ــــ غرور نہ کرنا ۱۷۷ ــــ سخاوت ۱۸۲ ــــ ایثار ۱۸۷ ــــ اختتامیہ (ہدف اور وسیلہ) ۱۹۴

تیسرا حصّہ ۲۰۱

انسان کا معاشرتی اخلاق

باب اوّل : ۱۵ اخلاقی صفات جو اجتماعی روابط کے لئے ضروری ہیں ۲۰۳ ــــ خوش اخلاقی ۲۰۴ ــــ صلح پسندی ۲۰۸ ــــ انصاف ۲۰۹ ــــ لوگوں سے بے نیازی ۲۱۰ ــــ غضبناک نہ ہونا ۲۱۲ ــــ معاف کرنا ۲۱۵ ــــ نیکی اور احسان کرنا ۲۱۷ ــــ برائی کا جواب نیکی سے دینا ۲۲۱ ــــ حسد نہ کرنا ۲۱۲ ــــ حسد کے اسباب ۲۲۴ ــــ حسد کا فقہی حکم ۲۲۶ ــــ تواضع ۔ تکبر سے اجتناب ۲۲۹ ــــ توجہ طلب نکتہ ۲۳۳ ــــ لڑائی جھگڑے سے بچنا ۲۳۵ ــــ صداقت ۲۳۷ ــــ عدالت ۲۳۸ ــــ ایک چونکا دینے والی روایت ۲۳۹ ــــ ظالموں کی طرف رجحان ۲۴۲ ــــ

دوسرا باب ــــ مختلف لوگوں کے ساتھ انسانی اخلاق ۲۴۳ ــــ مسلمانوں

اور مؤمنین کے ساتھ اخلاق ۲۴۴ ــــ کفار سے اخلاقی برتاؤ ۲۵۲ ــــ بدکاروں سے
اخلاقی سلوک ۲۵۵ ــــ مفسدین اور گمراہ لوگوں سے مقابلہ ۲۵۷ ــــ والدین سے اخلاق
۲۶۰ ــــ اولاد سے اخلاقی سلوک ۲۶۳ ــــ قریبی رشتہ داروں سے اخلاقی
برتاؤ ۲۶۴ ــــ ہمسایوں سے اخلاقی روابط ۲۶۵ ــــ اہل علم سے اخلاقی برتاؤ ۲۶۵
ــــ بزرگوں سے اخلاقی برتاؤ ۲۶۷ ــــ مرد اور عورت کے درمیان اخلاقی روابط
۲۶۷ ــــ حکومت اور عوام کے درمیان اخلاقی روابط ۲۷۱ ــــ اختتامیہ - اخلاقی
آیات ۲۷۳ ــــ بعض اخلاقی روایات ۲۷۹ ــــ اخلاقی داستانیں ۲۸۲ ــــ آخری
داستان ۲۸۹ ــــ دعا کے بارے میں ۲۹۰ ــــ اختتامیہ - دعا کی قسمیں ۲۹۷
ــــ شرائطِ دعا ۲۹۹ ــــ شرائطِ دعا کے بارے میں ایک نکتہ ۳۰۳ ــــ جن کی دعا قبول یا رد
ہوتی ہے ۳۰۷ ــــ وہ لوگ جن کی دعا قبول ہوتی ہے ۳۰۸ ــــ دعا قبول نہ ہونے کی وجہ
۳۰۹ ــــ ایک اور اعتراض ۳۱۲ ــــ دعا قبول ہونے میں تاخیر ۳۱۳ ــــ یادِ خدا کا بیان

JAFRI BOOK LIBRARY
Shop No. 11, ...
Soldier Bazar
Karachi.
MASOOMEEN WELFARE TRUST (R)

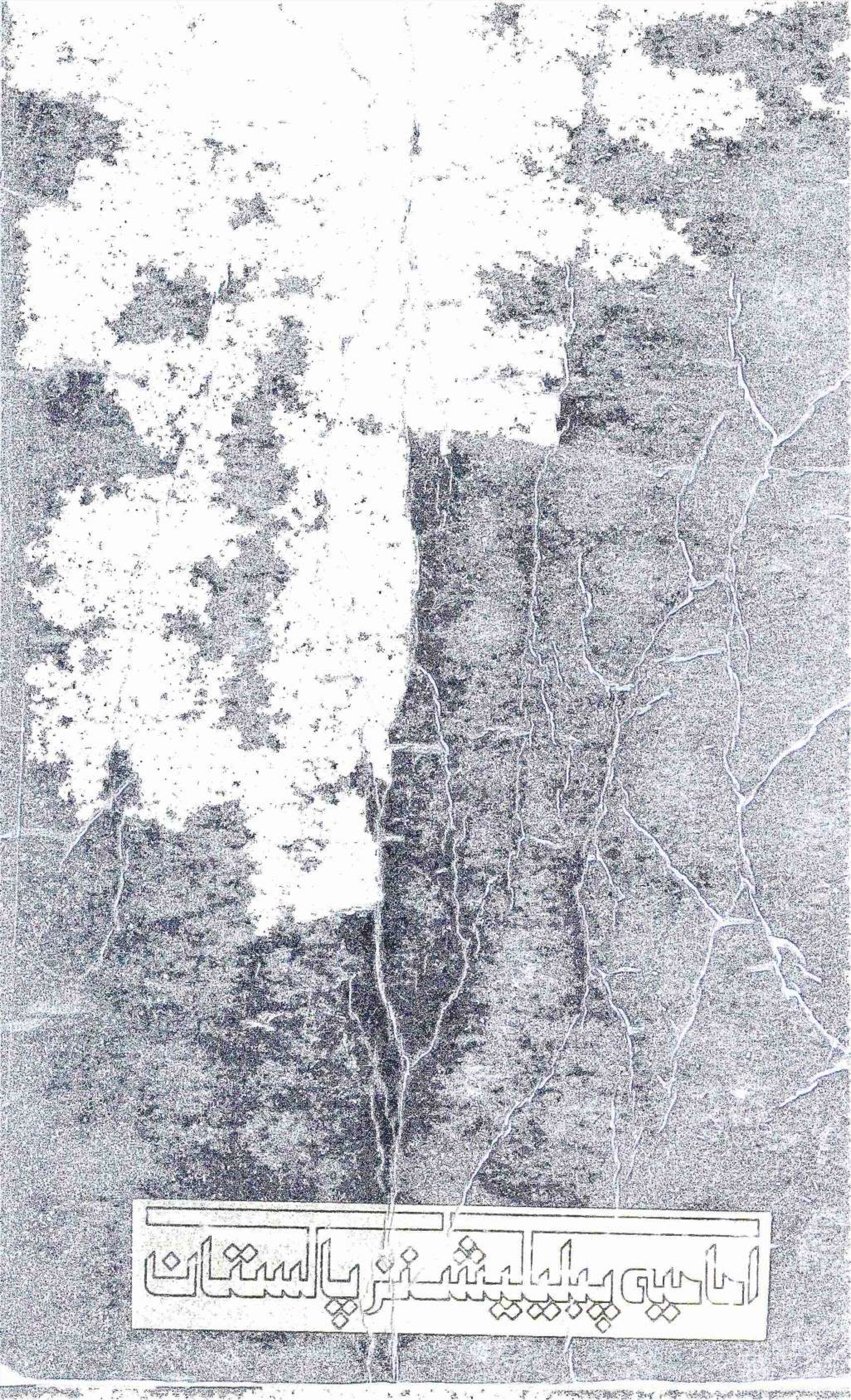

پبلیشنز پاکستان